Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1960ء

آئین پاکستان کی دوسری شق

یہ ہونی چاہئے کہ مملکت پاکستان ایسا انتظام کریگی جس سے ہر فرد مملکت کو (اسکی اور اس کے بیوی بچوں کی) بنیادی ضروریات زندگی (مثلاً روٹی کپڑا ۔ مکان ۔ علاج ۔ تعلیم ۔ وغیرہ) باطمینان ملتی رہیں ۔ اور کوئی شخص ان سے محروم نہ رہنے پائے ۔

We ask that the coming
CONSTITUTION OF PAKISTAN

shall lay down categorically that the State shall ensure that every citizen (and his family) is provided assuredly with basic necessities of life (food, clothing, house, education, medical aid, etc.) and that no one remains without them.

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون:- ۷۵۰۰
ہندوپاکستان سے سالانہ:- آٹھ روپے	ہندوپاکستان سے	خط وکتابت کا پتہ
غیر ممالک سے:- ۱۶ شلنگ	بارہ آنے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔بی۔گلبرگ۔لاہور

جلد ۱۳	مارچ سنہ ۱۹۶۰ء	نمبر ۳

— فہرست مضامین —

لمعات		۲
روزہ کے احکام		۱۰
قرآن کا سیاسی نظام	(محترم پرویز صاحب)	۱۷
سرسید احمد خاں	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۵
چیونٹی یا انسان؟	(محترم عطاء اللہ صاحب پاوی)	۶۱
اسلام کی سرگزشت		۷۲
طلوعِ اسلام کنونشن و رابطۂ باہمی		۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حال ہی میں مرکزی حکومتِ پاکستان نے ایک کمیٹی بدیں غرض مقرر کی تھی کہ وہ راولپنڈی شہر کا معاشی اور معاشرتی جائزہ لے۔ اس جائزہ کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ اس سطح کا جس پر ہمارے عوام زندگی بسر کر رہے ہیں، عبرتناک اور تاسف انگیز مرقع ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ راولپنڈی میں بسنے والے ترپن ہزار (۵۳،۰۰۰) خاندانوں میں سے قریب ایک چوتھائی (ہندوستان اور پاکستان کے) دیہات سے منتقل ہو کر شہر میں آ گیا ہے اور اس نقلِ مکانی کی بڑی وجہ معاش ہے۔ شہر میں قریب تین ہزار خاندان اُن دکانوں میں رہتے ہیں جن میں دن کے وقت کاروبار ہوتا ہے۔ قریب دو ہزار خاندان ایسے چھپروں اور جھونپڑوں میں رہتے ہیں جو انسانی رہائش کے قطعاً قابل نہیں۔ شہر کے گندے پانی کا ایک نالہ ہے۔ بہت سے خاندانوں نے اس نالے کے کنارے غار سے بنا رکھے ہیں اور وہ انہی غاروں میں زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ شہر میں پچھتر فیصد مکانات میں پانی کے نل نہیں۔ چالیس فیصد میں بجلی نہیں اور پچیس فیصد مکانات ایسے ہیں جن میں علیحدہ بیت الخلاء نہیں۔[1]

اس باب میں راولپنڈی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ وہاں کے یہ شواہد اس لئے سامنے آ گئے کہ اُس شہر کا جائزہ لیا گیا ہے اگر دوسرے شہروں کا بھی اسی طرح جائزہ لیا جائے تو وہاں کے حالات اگر اس سے بدتر نہیں تو بہتر بھی نہیں پائے جائیں گے۔ اور اگر شہروں سے دور ہٹ کر دیہات کی طرف چلے جائیں تو وہاں کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ سامنے آئے گی شہروں کے رہنے والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

نیز یہ جائزہ صرف رہائشی حالات کے متعلق لیا گیا ہے اگر ان لوگوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے حالات کا جائزہ بھی لیا جاتا تو ایسا کرب انگیز نقشہ سامنے آتا جس سے ہر قلبِ حساس خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جاتا۔ ہمیں نظر آ جاتا کہ ہمارے ہاں کتنے فیصد

---

[1] بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۳ فروری سنہ ۱۹۶۰ء

آبادی کی ہے جنھیں دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ کتنے لوگ ہیں جنھیں تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر نہیں۔ کتنے مریض ہیں جو دوا دارو نہ ملنے کی وجہ سے قبروں تک جا پہنچتے ہیں۔ کتنے خاندان ہیں جن کے پاس مُردے کی تجہیز و تکفین تک کا سامان نہیں ہوتا۔ کتنے بچے ہیں جو مناسب غذا (دودھ وغیرہ) نہ ملنے کی وجہ سے کمزور رہ جاتے یا مر جاتے ہیں۔ کتنے ہیں جو ذرا بڑے ہو کر، مدرسے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے اور آوارہ ہو جاتے ہیں۔ کتنے گھرانے ہیں جن میں جوان لڑکیاں مناسب بَر نہ ملنے کی وجہ سے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ کتنے خاندان ایسے ہیں جن کے پاس اتنا بھی نہیں ہوتا کہ وہ دو جوڑے کپڑے دے کر بیٹی کو گھر سے اٹھا سکیں۔ کتنی شادی شدہ لڑکیاں ہیں جو مساعد حالات (مناسب خوراک یا انسانوں جیسا سلوک) نہ ملنے کی وجہ سے (جس کا بیشتر سبب معاش ہوتا ہے) تپ دق کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کتنی بیوائیں ہیں جن کے پاس، سامانِ زیست تو ایک طرف، ستر ڈھانپنے کے لئے کپڑے تک نہیں۔ کتنے یتیم ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کتنے لاوارث بوڑھے ہیں جن کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ زندگی کے باقی سانس پورے کس طرح کئے جائیں؟ اگر یہ کوائف معلوم کرنے کے لئے پورے ملک کا نہیں بلکہ کسی ایک شہر یا گاؤں کا جائزہ لیا جائے تو ایسے ایسے دردانگیز مناظر سامنے آئیں جنہیں شاید ہی کوئی چشمِ بینا برداشت کر سکے۔ (آئندہ سال پاکستان کی مردم شماری ہونے والی ہے۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ اس کے ساتھ ہی یہ معلومات بھی فراہم کرلے تاکہ ملک کے باشندوں کی معاشی اور معاشرتی حالت کا اندازہ ہو سکے۔ اس سلسلہ میں ہم کسی دوسرے وقت خصوصیت سے لکھیں گے)۔

لیکن اس قسم کے جائزہ کے ساتھ، دوسری طرف یہ جائزہ لینا بھی ضروری ہوگا کہ ملک میں کتنے خاندان ایسے ہیں جن میں سے ایک ایک شخص کے پاس بیسیوں (مکانات نہیں بلکہ) ایسے ایسے محلات ہیں جن میں پورا کا پورا محلہ آباد ہو سکتا ہے۔ کتنے امراء ایسے ہیں جو کچھ ان کے کتوں پر صرف ہوتا ہے اس سے کتنے غریب گھرانے پل سکتے ہیں۔ کتنے دولت مند ایسے ہیں کہ جن کے ایک ہفتہ کے تفریحی خرچ سے شہر بھر کے لاعلاج مریضوں کو دوا دارو مل سکتی ہے۔ کتنے "نو دولتی" خاندان ایسے ہیں جنھیں معلوم ہی نہیں کہ ان کے پاس کس قدر دولت جمع ہے اور اس میں ہر روز کتنا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر اس قسم کا جائزہ بھی سامنے آجائے تو پھر صحیح صحیح اندازہ لگ سکے کہ ملک کی معاشی حالت کیا ہے اور عوام کی زبوں حالی کے اسباب و علل کیا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ہمارے ہاں یہ اعداد و شمار مرتب نہیں کئے گئے کہ ملک کی قومی دولت کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے۔ ہندوستان کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ملک کی دولت کا ایک چوتھائی حصہ، تین فیصد آبادی (بڑے بڑے دولت مندوں) کے پاس چلا جاتا ہے۔ ۲/۵ حصہ، پندرہ فیصد آبادی لے جاتی ہے۔ اور بقایا ایک تہائی دولت ملک کے عوام، یعنی بیاسی فیصد (۸۲٪) آبادی کے حصہ میں آتی ہے[1]۔ یعنی اگر ملک کی آمدنی ایک سو روپیہ فرض کرلی جائے اور آبادی بھی ایک سو، تو اس میں سے پچیس روپے، اوپر کے طبقہ کے تین آدمیوں کے حصہ میں آجاتے ہیں۔ چالیس روپے پندرہ آدمی لے جاتے ہیں۔ اور بقایا بیاسی افراد کے حصے میں صرف پینتیس روپے آتے ہیں۔ یعنی

۱۔ PAKISTAN TODAY - (LONDON) - OCTOBER, 1959

جب اوپر کے طبقے کے ہر فرد کو قریب سوا آٹھ روپے ملتے ہیں تو عوام کو سات آنے فی کس سے بھی کم۔ اگر ہمارے ملک میں تقسیم دولت کا تناسب ایسا ہی ہو تو اس سے بآسانی اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ عوام کی زبوں حالی کا بنیادی سبب ملک کی دولت کی غیر مساوی (یا ناہموار) تقسیم ہے۔ اگر اسی دولت کو ضروریات کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو عوام کی زندگی کی سطح کافی اونچی ہو سکتی ہے۔

فروری سنہ ۱۹۶۰ء کے دوسرے ہفتہ میں لاہور میں سیٹو (SEATO) کا ایک مذاکرہ بدیں غرض منعقد ہوا تھا کہ ممالک کمیونزم کے جن خطرات سے دوچار ہو رہے ہیں، ان کے دفعیہ کے لئے مناسب تدابیر سوچی جائیں۔ اس مذاکرہ کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے موقر جریدہ پاکستان ٹائمز (لاہور) نے اپنی ۱۴ر فروری کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے۔ اس میں اس نے ان خطرات کو اجاگر کیا ہے جو دنیا کو کمیونزم کی طرف سے پیش آ سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ خطرات اپنے مقام پر صحیح ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہیں جو خطرہ کمیونزم کی طرف سے لاحق ہو سکتا ہے اس کے مقابلہ میں وہ خطرات جو دیگر ممالک کو پیش آ سکتے ہیں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ دیگر (غیر مسلم) ممالک کو کمیونزم کی طرف سے جو خطرہ ہو سکتا ہے وہ ان کے معاشی یا سیاسی نظام (اقتدار) پر زد پڑنے کا امکان ہے لیکن مسلمانوں کے ہاں اگر کمیونزم کا تسلط ہو جائے تو ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں، کمیونزم ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو اسلام کے تصورِ حیات کی نقیض ہے۔ اس لئے نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، نہ مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ ہم پر کمیونزم اثر انداز نہ ہونے پائے۔ کمیونزم کے "روحانی اور فکری" گوشے کے متعلق جریدۂ مذکور رقمطراز ہے۔

> مشرق میں کچھ عرصہ سے مذہب ایک قوت کے اعتبار سے زوال پذیر ہو گیا ہے۔ یہ چیز بالخصوص ان ممالک میں واقع ہوئی ہے جن پر مغربی ممالک لمبے عرصہ تک حکومت کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ روایاتی ضابطہ اخلاق جو مشرق میں مذہب کی بنیادوں پر استوار تھا، بڑی حد تک کمزور پڑ گیا۔ جو روحانی خلا اس طرح پیدا ہوا ہے وہ کمیونزم کے پراپیگنڈا میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ ..... ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کے اپنے اپنے مذہب پر ایمان کو از سر نو استوار کیا جائے۔ یہ کام دیگر سیٹو ممالک کے مقابلہ میں پاکستان کے لئے زیادہ آسان ہے۔ اس لئے کہ یہاں کی آبادی کی اکثریت ایسے مذہب کی پیرو ہے جو انہیں صرف ایک ضابطۂ اخلاق ہی نہیں دیتا بلکہ ایک ترقی پذیر آئیڈیالوجی اور معاشرتی عدل اور معاشی تقاضوں کے مناسب حل کے لئے مثبت تصورات بھی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اسلام کی گرفت اس لئے ڈھیلی پڑ گئی ہے کہ دیگر مسلم ممالک کی طرح یہاں بھی مذہبی تبلیغ کی اجارہ داری ان تنگ نظر مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں آ چکی ہے جو اسلام کے ترقی پذیر اصولوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی ان میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اسلام کو ایسے انداز میں پیش کریں جو دورِ حاضرہ کے ذہن کو اپیل کر سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کے طول و عرض میں منظم کوشش کے ذریعے اسلام کی صحیح روح لوگوں کے دل و دماغ تک پہنچا دی جائے۔ اس کی انسانیت ساز اور اعتدال پسند تعلیم کو عام کیا جائے۔ اور ایک انقلابی تحریک ہونے کی حیثیت سے اس میں جو قوتیں مضمر ہیں، انہیں نظم و ضبط سے بروئے کار لایا جائے۔ اس طریق سے ہم مارکسزم کے

خطرہ کی روک تھام کے لئے اپنے ہاں مضبوط بند بنا سکیں گے۔

نظری طور پر دیکھا جائے تو کمیونزم کی روک تھام کے لئے یہ تدابیر بڑی خوش آئند اور جاذب نگاہ معلوم ہوں گی لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس عظیم خطرہ کے صحیح اور اطمینان بخش سدباب کے لئے اس سے کچھ زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مشرق میں "مذہب" کے انحطاط کا سبب وہ نہیں جس کی طرف محترم معاصر نے اشارہ کیا ہے۔ (یاد رکھیئے کہ مذہب سے ہماری مراد دنیا کے مروجہ مذاہب ہیں جو انسانوں کے خود ساختہ ہیں۔ اس سے مراد اسلام نہیں جو خدا کا دیا ہوا الدین ہے)۔ "مذہب" کے متعلق مارکس کی یہ تحقیق بالکل مبنی بر حقیقت ہے کہ یہ وہ افیون ہے جسے سرمایہ پرستوں نے غریبوں کو مدہوش رکھنے کے لئے ایجاد کر رکھا ہے۔ "مذہب" کی بنیاد اس تعلیم پر ہے کہ عقل و فکر کو کبھی کام میں نہ لاؤ۔ اور رزق کو خدا کا عطیہ سمجھو کہ وہ جسے چاہے زیادہ دے جسے چاہے کم دے۔ ہمارے زمانے میں سائنٹفک ترقی اتنی تیزی سے ہوئی (اور ہو رہی ہے) کہ اس نے لوگوں کو عقل و فکر سے کام لینے پر مجبور کر دیا۔ یوں مذہب کا وہ بازو کمزور ہو گیا جو توہم پرستی کی بنا پر اپنے دعاوی منوانا چاہتا تھا۔ جہاں تک "رزق" کا تعلق ہے جب لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا تقسیم رزق کا مسئلہ محض نظری حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب رزق کی تنگی عام ہو گئی تو بھوکے مجبوراً سوچنے لگے کہ یہ کیا ہے کہ امیر آدمی کے کتے کو وہ کچھ ملتا ہے جو غریب آدمی کے بچے کو کبھی نہیں مل سکتا؟ جب ان سے کہا گیا کہ یہ خدا کی دین ہے اور اس کی تقسیم" تو غریبوں نے تنگ آکر کہہ دیا کہ ہمارا اس خدا کو سات سلام، جو انسان کے بچے کو پیدا تو کر دے لیکن اس کے بعد اسے پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہ دے۔ یوں مذہب کا یہ دوسرا بازو بھی جڑ سے ہل گیا۔ "مذہب" کی گرفت کے ڈھیلا پڑ جانے کی بنیادی وجوہات یہ ہیں۔ اس میں نہ ان مغربی اقوام کا کوئی دخل ہے جنہوں نے مشرقی ممالک پر حکمرانی کی۔ نہ کمیونزم کی کوئی خاص کارگری ہے۔ یہ زمانے کے تقاضے ہیں اور یہ فطرت کا اصول ہے کہ جو چیز زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی، وہ باقی نہیں رہ سکتی۔

ہمارے ہاں جو اسلام آجکل مروج ہے وہ ہمارے اُس دور کی پیداوار ہے جب ملوکیت، سرمایہ داری اور پیشوائیت کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا جن عناصر کا مجموعہ دنیا کے دیگر مذاہب ہیں وہی اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ جب دیگر مذاہب کا وہ حشر ہوا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو (ہمارا خود ساختہ) اسلام اس زد سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا؟ اس کے زوال کا باعث یہ نہیں کہ اس کا [illegible] کرنے والا ان پڑھ ملّا ہے۔ اسے اگر پڑھا لکھا طبقہ پیش کرتا تو بھی یہ باقی نہ رہ سکتا۔ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ یاد رکھیئے۔ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظریہ یا نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تو صرف خدا کے عطا فرمودہ الدین کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دیتا اور انسانی فکر کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتے جاتا ہے۔ یہی الدین (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے) کمیونزم کے سیلاب بلا کا پورا پورا مقابلہ کر سکتا ہے۔ پاکستان ٹائمز نے ٹھیک کہا ہے کہ پاکستان میں کمیونزم کی روک تھام نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ یہاں کی آبادی کی اکثریت اسلام کو اپنا مذہب سمجھتی ہے۔ یہ اسلئے آسان ہے کہ ہم یہاں قرآن کا معاشی نظام عملاً نافذ کر سکتے ہیں — اور کمیونزم کی روک تھام صرف قرآن کا معاشی نظام کر سکتا ہے — یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیم کا عام کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں قرآنی نظام کا عملی

قیام اس کی نظری تعلیم کے مقابلہ میں، اشد ضروری ہو چکا ہے۔ زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ اب نظامِ سرمایہ داری کی کسی شکل کو بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مغربی ممالک چاہتے ہیں کہ وہ اپنے نظامِ سرمایہ داری میں کتر بیونت سے کمیونزم کی روک تھام کر لیں۔ لیکن یہ ان کی بھول ہے۔ زمانے کے تقاضوں کی تسکین اس قسم کی مفاہمت (COMPROMISE) سے نہیں ہو سکتی۔ مغربی ممالک کی مشکل یہ ہے کہ وہ اگر اپنا نظام چھوڑ دیں تو ان کے سامنے کمیونزم کے سوا کوئی اور نظام نہیں رہتا۔ (ان کے اپنے پاس کوئی متبادل نظام ہے نہیں) لیکن ہمارے لئے اس باب میں کوئی مشکل نہیں۔ ہمارے پاس قرآن کا عطا کردہ ایسا معاشی نظام ہے جو ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامی کا ازالہ کر دیتا ہے اور دوسری طرف کمیونزم کی انسانیت سوز تباہیوں سے بچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں کمیونزم کی روک تھام دوسرے ممالک کے مقابلہ میں آسان ہے۔

پاکستان کیلئے ایک جدید آئین کی تدوین کا مسئلہ زیرِ نظر ہے۔ اگر یہ آئین قرآن کریم کی بنیادوں پر مرتب ہو گیا تو اس میں قرآن کا معاشی نظام خود بخود آ جائے گا۔ یہ وہ نظام ہو گا جو ایک طرف کمیونزم کی پوری پوری روک تھام کر سکے گا اور دوسری طرف مغربی اقوام کو بتا سکے گا کہ وہ بھی کمیونزم کی تباہ کاریوں سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے اپنے آئین کو قرآنی پیکر میں ڈھالنے کی بجائے اسے مغربی اقوام کے نقوش پر چلایا۔ یا اس آئین میں مفاہمتوں (COMPROMISES) سے کام لینا چاہا، تو مغربی اقوام تو شاید (اپنی سائنٹیفک ترقیوں کے بل بوتے پر) کچھ دن اور جی جائیں لیکن ہماری تباہی کسی کے روکے نہیں رک سکے گی۔ پاکستان ٹائمز نے کمیونزم کی روک تھام کے سلسلہ میں یہ بھی کہا ہے کہ

> آزاد دنیا کی خوشحال اقوام کی طرف سے ایشیاء کے پسماندہ علاقوں کی معاشی اور ٹیکنیکل امداد کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے کام کی چیز ثابت ہو گی۔ نظری طور پر اعداد و شمار کی رو سے دیکھا جائے تو ان اقوام کی طرف سے جو امداد اس وقت تک ملی ہے وہ معتدبہ دکھائی دے گی۔ لیکن جب ان پسماندہ ممالک کی ضروریات کو دیکھا جائے تو یہ امداد بہت کم ہے۔ جب تک ان اقوام کی طرف سے پوری پوری امداد نہ ملے ان پسماندہ ممالک کے لئے یہ ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہو گا کہ وہ اپنے ہاں اس تیزی سے معاشی ترقی کر سکیں جو ان کے عوام کی توقعات کو پورا کر سکے۔ اور جب تک ایسا نہ کیا جائے گا، کمیونزم عوام کی تباہ حالی سے جو ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے اس کا تدارک نہیں ہو سکے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض ہنگامی حالات میں، قوموں کی زندگی کے لئے خارجی امداد ناگزیر ہو جاتی ہے ــــ دنیا کے کام باہمی تعاون و تناصر سے چلتے ہیں۔ لیکن خارجی امداد کسی قوم کی مشکلات کا مستقل حل کبھی نہیں ہو سکتی۔ قوموں کا ثبات، ان کے صلاحیت بخش نظام پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اپنے ہاں صلاحیت بخش نظام رائج نہ کیا ــــ اور قرآنی نظام سے زیادہ صلاحیت بخش نظام دنیا میں اور کونسا ہو سکتا ہے ــــ تو خارجی امداد ہمیں اس تباہی سے کبھی نہیں بچا سکتی جو غیر صالح نظام کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا مجبوری دور کے لئے خارجی امداد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس حقیقت کو کبھی، ہر وقت پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہماری زندگی، فلاح

اور بقاء یہ دوام کا راز قرآنی نظام کے قیام میں مضمر ہے اور اس کے لئے موزوں ترین وقت یہی ہے جب ہمارا آئین نو مرتب ہونیوالا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، اگر یہ آئین قرآنی خطوط پر متشکل ہو گیا تو ہم نہ صرف کمیونزم کے سیلاب بلا سے بچ جائینگے بلکہ دنیا کی امامت ہمارے حصے میں آجائیگی۔ اس لئے کہ دنیا کے پاس اس وقت کوئی صالح نظام نہیں اور وہ ایسے نظام کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ اگر ہم نے اپنے ہاں قرآنی نظام رائج کر لیا تو اس کے زندگی بخش نتائج کو دیکھ کر اقوامِ عالم ہمارا اتباع کریں گی۔ اور یہی قرآن کی حامل امت کا صحیح مقام ہے۔

ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ محترم صدرِ مملکت کی طرف سے آئین کمیشن کے تقرر کا اعلان اخبارات میں آگیا۔ اس کمیشن کے صدر، پاکستان کی سپریم کورٹ کے جج، محترم شہاب الدین صاحب ہیں اور حسب ذیل دس ارکان۔

<u>مشرقی پاکستان</u>۔ (۱) مسٹر عزیز الدین (سابق صوبائی وزیر) (۲) مسٹر ڈی۔ این بروری (اقلیتوں کے نمائندہ) (۳) مسٹر اے۔ ایس چوہدری (بیرسٹر) (۴) مسٹر اے۔ آر۔ ناظم (نمائندہ طبقہ متوسط) (۵) مسٹر آفتاب الدین (طبقہ زراعت کا نمائندہ)

<u>مغربی پاکستان</u>۔ (۱) محترم جسٹس محمد شریف (سابق جج سپریم کورٹ) (۲) مسٹر نصیر شیخ (نمائندہ صنعت) (۳) ارباب احمد علی جان (ریٹائرڈ سیشن جج۔ سابق صوبہ سرحد) (۴) سردار حبیب اللہ (نمائندہ زراعت) (۵) مسٹر طفیل علی (سابق صوبہ سندھ کے وکیل)۔

ہم ان حضرات میں جسٹس محمد شریف صاحب کے سوا کسی کے متعلق نہیں جانتے کہ اسلام کے متعلق ان کے تصورات کیا ہیں اور قرآنی نظامِ مملکت کے سلسلہ میں ان کے خیالات کیا۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حضرات اپنی طرف سے جو سفارشات پیش کریں گے، قرآنی نقطۂ نگاہ سے وہ کس قسم کی ہونگی۔ محترم جسٹس شریف صاحب کا قارئین طلوعِ اسلام سے سابقہ تعارف ہے۔ آپ اسلامک لاز کمیشن کے صدر تھے، اور اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں ان کا ذکر اکثر و بیشتر آتا رہا۔

اس کمیشن کے "حدودِ تحقیق و سفارشات" کے سلسلہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ

(۱) اس امر کی تحقیق کی جائے کہ پاکستان میں پارلیمانی نظامِ حکومت اور سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی ناکامی کی وجوہات اور اسباب کیا تھے؟ اور اس امر پر غور کیا جائے کہ وہ کونسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے اس قسم کے اسباب دوبارہ پیدا نہ ہوں۔ اور

(۲) ملک کے حالات کا پورا پورا جائزہ لینے کے بعد ایسی آئینی سفارشات پیش کی جائیں جن سے حسب ذیل مقصد حاصل ہو سکے۔

<u>مقصد</u>۔ ایک ایسی جمہوریت کا قیام جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ جو اسلام کے اصولِ عدل، مساوات اور رواداری پر مبنی ہو اور جس سے قومی وحدت مستحکم ہو اور نظامِ حکومت کو ثبات و قرار حاصل ہو۔

اس اعلان کی رو سے مجوزہ آئین کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اسلام کے اصولِ عدل، مساوات اور رواداری پر مبنی ہونا چاہیئے۔ جہاں تک

الفاظ کا تعلق ہے ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہی (بلکہ ان سے بھی دو چار زیادہ) الفاظ درج تھے۔ اس کی تمہید میں کہا گیا تھا کہ اس میں "اسلام کے اصولِ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری، اور عدلِ عمرانی" کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ

مسلمانانِ پاکستان اس قابل ہو سکیں کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کی اس تعلیم اور تقاضوں کے مطابق بسر کر سکیں جو قرآن و سنت میں دیئے گئے ہیں۔

اور ان دعاوی کے ساتھ آئین میں ان اسلامی اصولوں کی جس طرح مٹی پلید کی گئی تھی، اس سے سب واقف ہیں۔ لہٰذا اصل سوال الفاظ کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان الفاظ کی تعبیر کیا کی جاتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے عملی طریق کیا تجویز کیا جاتا ہے۔

اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کمیشن ایک سوالنامہ کے ذریعے آئین سے متعلق لوگوں کے خیالات معلوم کرے گا۔ اسلامی آئین کے سلسلہ میں طلوع اسلام کے صفحات میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ قارئین طلوع اسلام کے ذہن میں، اس باب میں، کس قسم کا ابہام، التباس یا الجھاؤ نہیں رہا ہوگا اور ان پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہوگا کہ اسلامی آئین کا نقشہ کس قسم کا ہوتا ہے۔ طلوع اسلام ان تصورات کی نشر و اشاعت اسی طرح کرتا رہے گا جس طرح اب تک کرتا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ اس کا ارادہ ہے کہ "اسلامی آئین کے بنیادی اصولوں" کو یکجا (پمفلٹ کی شکل میں) شائع کر کے اس کی عام اشاعت کی جائے۔ امید ہے کہ یہ پمفلٹ آئندہ طلوع اسلام کنونشن میں (جو ۸-۹-۱۰ اپریل کو لاہور میں منعقد ہونے والی ہے) پیش کیا جا سکے گا۔ اس سے قارئینِ طلوع اسلام کو کمیشن کے سوالنامہ کی ان شقوں کا جواب دینے میں آسانی ہو جائے گی جن کا تعلق اسلامی تصورات سے ہوگا۔

جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، یہ وقت اسلام کی تاریخ میں بڑا نازک ہے۔ پاکستان وہ خطۂ زمین ہے جس میں اسلامی نظام کے قیام کے امکانات ہیں۔ اس نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس مملکت کا آئین اسلامی ہو۔ یہ سوال ایسا نہیں جس کے متعلق آپ سمجھ لیں کہ اس کا تعلق صرف آئین کمیشن سے ہے۔ اس کا تعلق پاکستان کے ہر مسلمان سے ہے۔ اس لئے اس آئین کی تدوین میں ہر مسلمان کا حصہ لینا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کا اس وقت طریقہ یہ ہے کہ کمیشن کے دیافت کرنے پر آپ انہیں بتائیں کہ آپ کے نزدیک اسلامی آئین کسے کہتے ہیں اور آپ کی یہ آواز کس قدر شدید ہے کہ ہمارا مجوزہ آئین قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیئے۔

لغات القرآن

طلوع اسلام کے صفحات میں اس لغات القرآن (اور مفہوم القرآن) کا چرچا ایک عرصہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے جسے پرویز صاحب نے اپنی مدت العمر کی محنت و کاوش سے مرتب کیا ہے۔ لغات القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں جو دشواریاں تھیں، وہ بحمد اللہ دور ہو گئی ہیں اور اب اس کی باقاعدہ چھپائی شروع ہو گئی ہے۔ اس لغات کا تفصیلی

تعارف طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں کرایا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ صرف قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہیں بلکہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں قرآنی الفاظ کے بنیادی معانی کے ساتھ، قرآنی تعلیم کے تصورات (CONCEPTS) اور قرآنی نظام کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس لغت کا بغور مطالعہ کر لیا جائے تو اس کے بعد قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی پہلی جلد (جو پانسو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوگی) وسط اپریل تک تیار ہو جائے گی اور اس کے بعد بقایا جلدیں یکے بعد دیگرے طبع ہوتی چلی جائیں گی۔ امید ہے کہ پوری لغات چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہو جائے گی۔ چونکہ اس قسم کی ضخیم اور نادر کتابوں کی طبع ثانی کی باری بمشکل آیا کرتی ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جو اصحاب اسے حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ اپنا نسخہ پہلے سے ریزرو کرا لیں۔ اس کے لئے ناظم ادارہ طلوع اسلام کو اطلاع دے دیجئے۔ چونکہ لغات کا حساب الگ رکھا گیا ہے اس لئے پیشگی خریداروں کو یہ کتاب ان کے کھاتے سے نہیں بھیجی جا سکے گی۔ انہیں بھی اس کا نسخہ الگ خریدنا ہوگا۔

لغات القرآن کی تکمیل کے بعد مفہوم القرآن کی اشاعت کی باری آئے گی۔

"قرآن کا سیاسی نظام"

یہ پمفلٹ، اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے۔ بزموں کو ان کی مستقل فرمائش کے مطابق بھیجا جا رہا ہے۔ اس کی عام اشاعت کی ضرورت ہے۔ اسے انگریزی خواں طبقہ تک ضرور پہنچایا جائے۔ (ناظم ادارہ)

جشنِ عید رمضان کی تقریب سعید کے سلسلے میں حسب سابق اس بار پھر

ادارہ طلوع اسلام کے زیر اہتمام

عید کارڈز

کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ عیدنامے جشنِ نزول قرآن کی اس عظیم سالگرہ کے شایانِ شان اور بیحد دیدہ زیب دلآویز اور نظر افروز ہوں گے۔ بزمہائے طلوع اسلام، اور دیگر حلقے اپنے اپنے احباب کو بھیجنے کے لئے حسب ضرورت منگوا سکتے ہیں۔ قیمت فی کارڈ۔ چھ آنے)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق[1]) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورۃ البقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ

(۴) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(۵) اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو یہ اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ.....

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر

---

[1] ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔ (۲/۱۸۴-۱۸۵)

میں ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے۔

(۸) وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ۔ (۲/۱۸۷)

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

(۲) روزے میں اُس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے دن کے ختم ہونے تک، کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

(۳) روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) اب ایک مشکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے۔ اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمایئے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ "طاقت" کا ترجمہ اردو کے لفظ طاقت سے کر دیا۔ اور دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کرسکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِہٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صـ۳۳ نے جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صـ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اِلطَّاقَةُ دراصل مُکْنَتُ اور قُدْرَتْ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بدشواری اسے برداشت کرسکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے..... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَةٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنھیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔　　　(تفسیر کشاف صـ۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَةٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا آیہ زیر نظر کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے.....

(روح المعانی صـ۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَةٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ــــ کردینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ہم نے اس کا ترجمہ ـــــ اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸-۲۶۹ جلد ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے نیز ابن عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے۔ قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

> اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خملنے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۷ جلد ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت
۲۔ حاملہ عورتیں
۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں
۴۔ اپاہج اور معذور لوگ
۵۔ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔
۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONALLY) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔
۷۔ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔
۸۔ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآنِ کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)۔

لغات القرآن اور پیشگی خریدار حضرات

امید کی جا سکتی ہے کہ لغات القرآن کی پہلی جلد وسط اپریل تک چھپ جائے گی۔ چونکہ لغات کا فنڈ بالکل الگ ہے۔ اس لئے پیشگی خریداران کو یہ کتاب ان کے کھاتے کے حساب میں نہیں دی جائے گی۔ ان میں سے جو حضرات لغات کی پہلی جلد خریدنا چاہیں وہ اپنی فرمائش ادارہ کے نام بھیجدیں۔
جلد اول کی قیمت پندرہ روپے (علاوہ محصول ڈاک) ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵۔ بی ـــــ گلبرگ
لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام کی تازہ پیشکش

چار علم افروز اور گرانقدر کتابیں

(۱)

فجر الاسلام

علامہ احمد امین مصری کی شہرۂ آفاق تصنیف کا اردو ترجمہ۔
اسلام کی سرگزشت اور علمی ارتقاء کی داستان۔

(۲)

ضحی الاسلام

اسی سرگزشت کی اگلی کڑی۔۔۔!
علامہ موصوف کے قلم سے

(۳)

انسانی ذات

علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرارِ خودی کی تشریح
طلوعِ اسلام کے مخصوص طرزِ نگارش کا شاہکار۔

(۴)

فرد اور ملت

حضرت علامہ کی مثنوی رموزِ بیخودی
کی تشریح

ہر چہار کتابیں طباعت کے مرحلوں سے گذر کر عنقریب منظرِ اشاعت پر آرہی ہیں!!

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

کونسی کتاب؟

اسلامی ـــــ ثقافتی ـــــ تاریخی

علمی ـــــ ادبی ـــــ معلوماتی

جس انداز کی کتاب آپ کو پسند ہو اُس کا آرڈر ہمیں دیں۔ کتاب آپ کو روانہ کر دی جائے گی!!

ـــــ اِن میں سے دیکھیے ـــــ

المرشد الامین امام غزالیؒ کے قلم سے تصوف پر ایک نادر کتاب ہے۔ ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے کیا ہے۔ صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ قیمت ۶/۸ صفحات ۵۴۴

توہین کیا انسان کبھی توہین برداشت کر سکتا ہے؟ نہیں۔ لیکن عارف بٹالوی کے الفاظ میں "ہاں"۔ وہ کیسے؟۔ اس کا جواب عارف بٹالوی کے تازہ ناول "توہین" کے مطالعہ سے ملے گا۔ صفحات ۳۸۴۔ گرد پوش قابل دید۔ قیمت ۵/- روپے

حادثہ زندگی میں قدم قدم پر حادثات رونما ہوتے ہیں۔ کوئی اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے اور کوئی گرا کر عمیق گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے اب دیکھیے کہ قیسی رامپوری کا ناول حادثہ کسے کہاں پہنچاتا ہے۔ صفحات ۳۸۴ گرد پوش دیدہ زیب۔ قیمت ۵/۸

تاریخ اسلام رئیس احمد جعفری۔ جیسے ہمہ گیر صاحب قلم کی کاوش کا نتیجہ۔ اسلام کی تاریخ شگفتہ اور دلچسپ انداز میں۔
صفحات ۵۴۴ قیمت ۶/۸ مجلد

فرصت کے دن انسان کو زندگی میں فرصت کے دن بہت ہی کم ملتے ہیں۔ فرصت کے وقت بھی انسان مشغول رہتا ہے اس بات کو قیسی رامپوری نے اپنے اس ناول میں بڑی خوبی سے قلمبند کیا ہے۔ ضخامت ۳۳۶۔ قیمت ۵/-

عمر فاروق اعظمؓ محمد حسین ہیکل کی تصنیف اور حبیب اشعر کا ترجمہ ضخامت ۷۶۵ قیمت ۲۰/-

آن بعض اوقات انسان بغیر کسی قربانی کے بھی اپنی آن بچا لیتا ہے۔ کیسے؟ اس کا جواب رئیس احمد جعفری کا ناول آن پڑھ کر لیجیے۔ ضخامت ۳۲۰ قیمت ۴/۱۲ مجلد

پریشان ہونا چھوڑیئے جینا شروع کیجیے۔ قیمت ۳/- تذکرہ ۳/- غبارِ خاطر ۳/- حماقتیں ۳/- مزید حماقتیں ۳/-

ملنے کا پتہ:ـــــ **مکتبہ طلوعِ اسلام** ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ **لاہور**

باسمہٖ تعالیٰ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

قرآن کا سیاسی نظام

پرویز

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ لاہور

قرآن کا سیاسی نظام

باب اول ——— انسان نے کیا سوچا؟

جب انسانوں نے مل جل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے باہمی تنازعات پیدا ہوئے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس بیدار ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور اگر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو باہمی کشمکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ہو جائے تاکہ معاشرہ فساد اور جنگ و جدل سے محفوظ رہے۔ اس سے نظامِ سیاست کے تصور کی ابتدا ہوئی۔ ابتدا ہوئی تو اس ضرورت کے ماتحت لیکن جن لوگوں نے جھگڑے نپٹانے اور فیصلے کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا انھوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ اس لئے انھوں نے ایسی تدبیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہوا اقتدار چھننے نہ پائے۔ اس سے معاشرہ میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ بعض اوقات حکمراں طبقہ سے اس کا اقتدار اور اختیار چھیننے کے لئے کوئی دوسرا فریق کھڑا ہو جاتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محکوم طبقہ اپنے حکمراں طبقہ کے خلاف سرکشی پر آمادہ ہو جاتا۔ آپ غور کیجئے تو انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستان نظر آئے گی۔ یعنی

حاکم و محکوم کی کشمکش

(i) حکمراں طبقہ کی کوشش کہ ان کے اقتدار و اختیار کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں۔

(ii) فریقِ مقابل کی خواہش کہ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(iii) محکوم طبقہ کی سرکشی اور حکمراں طبقہ کی کوشش کہ انھیں دبا کر رکھا جائے۔

(iv) اور ارباب فکر و بصیرت کی یہ کاوش کہ ایسی کون سی تدبیر کی جائے جس سے معاشرہ میں سیاسی نظام بھی قائم رہے اور حاکم و محکوم میں کشمکش بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

قبل اس کے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے اہم ٹکڑوں کو سامنے لایا جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ اربابِ فکر و بصیرت نے اس باب میں کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔

قبائلی نظامِ حکومت

شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا یعنی ایک خاندان کے افراد مل جل کر رہتے تھے۔ اسے ان کا قبیلہ کہا جاتا تھا۔ قبیلہ کا بزرگ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا اس لئے باہمی نزاعات کے فیصلے کرنے کا فریضہ اسی کا ذمہ تھا۔ اس کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع تھا۔ رفتہ رفتہ ان "بزرگانِ خاندان" کے دل میں بھی جذبۂ حکومت نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" (یا سعدی کے الفاظ میں) "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ اسلاف کی پرستش (ANCESTRAL WORSHIP) اسی عقیدہ کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔

خداوندی اختیارات کا عقیدہ

انسان کی ابتدائی زندگی میں مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ (اب بھی جہاں جہاں جہالت اور توہم پرستی کا دور دورہ ہے مذہبی پیشواؤں کی پرستش ہوتی ہے) وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا۔ اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ ان مذہبی پیشواؤں نے عوام کی اس عقیدتمندی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے دائرہ اقتدار کو پرستش گاہوں کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر دنیاوی حکومت کے ایوانوں تک لے گئے۔ اس کے لئے انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کے حامل ہیں یعنی انہیں خدا نے حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے احکام خود خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت اور ان کی معصیت خدا کی معصیت ہے جس کی سزا اس دنیا میں عبرتناک عذاب ہے اور اگلی دنیا میں جہنم کی عقوبت۔ جب دوسرے حکمرانوں (بادشاہ وغیرہ) نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریقہ بڑا آسان اور نہایت کامیاب ہے ـــــ اس لئے کہ اس میں جسموں کی بجائے دلوں اور روحوں پر حکومت ہوتی ہے جس کے لئے نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑتی ہے نہ فوج کی حاجت ـــــ تو انھوں نے مذہبی پیشواؤں سے گٹھ جوڑ پیدا کیا۔ اس طرح، راجہ ایشور کا اوتار اور بادشاہ ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار پا گیا اور وہ اپنے احکام و فرامین کو خدا کے احکام کی حیثیت سے منوانے لگا۔ (انسان کے خود ساختہ) مذہب نے حکومت کی اس شکل کو بڑی تقویت پہنچائی ہے۔ اور ان "خدائی فوجداروں" کے ہاتھوں نوعِ انسانی پر جس قدر مظالم خدا کے نام پر ہوئے ہیں شیطان بیچارے کے حصے میں ان کا عشیر عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس نظامِ سیاست کو تھیاکریسی کہتے ہیں جسے عیسائیت نے خاص طور پر فروغ دیا تھا۔ ڈائی کونٹ سیموئیل، عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

تھیاکریسی

اس نے بادشاہوں کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تاکید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر تباہیاں پھیلائیں۔ ان کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے۔ (BELIEF AND ACTION P. 39)

یہ تو تھا مختلف تدابیر سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا۔ اس کے برعکس، ایسا بھی ہوا کہ کسی قبیلہ یا قوم میں جو شخص سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھتا تھا یا جس نے سب سے زیادہ مادی قوت فراہم کرلی، اس نے باقیوں کو دبا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی

جسکی لاٹھی اسکی بھینس

کہ حکومت کا یہ نظریہ شروع سے آج تک مسلسل کارفرما چلا آرہا ہے۔ اسلوب و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن "اصول" ہر جگہ یہی کارفرما ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ انسان کے عہدِ جہالت و بربریت میں بھی یہی ہوتا تھا اور آج زمانہ تہذیب و تمدن میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

جب اُن اربابِ فکر و نظر نے، جو حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، یہ دیکھا کہ معاشرہ کے اجتماعی نظام کی ضرورت کس مقصد کے لئے پیش آئی تھی اور اس سے فائدہ کیا حاصل کیا جا رہا ہے، تو انہوں نے اس نظام کو (اپنی دانست کے مطابق) صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ افرادِ معاشرہ کو باہمی رضامندی سے یہ طے کرنا چاہیئے کہ مملکت میں افراد کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے اور حکومت کے فرائض اور واجبات

نظریۂ میثاق

کیا؟ فریقین کے اِن طے شدہ حقوق و واجبات کی توثیق ایک معاہدہ کی رُو سے ہو جانی چاہیئے۔ اس نظریہ کو (THEORY OF CONTRACT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونان سے چلا آرہا تھا لیکن اٹھارویں صدی (عیسوی) میں اسے یورپ میں ہابز (HOBBES)، لاک (LOCKE) اور روسو (ROUSSEAU) نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ ڈیماکریسی (جمہوریت) کی بنیاد اس نظریہ پر ہے۔ یعنی "لوگوں کی باہمی رضامندی سے حکومت"۔

نظامِ سیاست کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کا آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے ــــ اسے

اقتدارِ اعلیٰ

اقتدارِ اعلیٰ یا (SOVEREIGNTY) کہتے ہیں ــــ جب زمامِ اقتدار مذہبی پیشواؤں یا بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی تو اس وقت یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (ہمارے زمانے میں، بادشاہوں کی جگہ ڈکٹیٹروں نے لے لی ہے اس لئے ان کی حکومت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا)۔ مذہبی پیشوا، بادشاہ یا ڈکٹیٹر خود مقتدرِ اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اندازِ حکومت جمہوری قرار پایا، تو اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کرلی۔ روسو کے نزدیک "اقتدارِ اعلیٰ" مملکت کے تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ لیکن لاک کے خیال میں یہ اقتدار افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیئے۔ بنتھم بھی لاک کا ہمنوا ہے۔ ڈیماکریسی نے اسی اصول کو اختیار کیا ہے ــــ اس کے برعکس، مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اس طبقہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس وسائلِ پیداوار ہوں ــــ نظامِ سرمایہ داری میں سرمایہ دار طبقہ کو ــــ اشتراکی نظام میں مزدوروں کو ــــ ہمارے دَور میں جمہوری نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر متمدن قومیں اسی کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نظریہ کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر ہے۔

جمہوری نظام

(۱) اس اندازِ حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر عوام ہی کی وساطت سے" کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یعنی

(GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE)

(۲) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۱۱) کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرت رائے ہوتا ہے۔

(۱۷) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے ہوتے ہیں

یہ وہ نظامِ حکومت ہے جس پر انسان اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ہے اور مغربی مفکرین کے نزدیک اس نظام سے بہتر نظام کا تصور ناممکن ہے۔ اس نظام کو آیۂ رحمت اور ضامنِ ہزار برکات و سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوعِ انسان کے ہمدرد و بہی خواہ اور اس کی مخالفت کرنیوالوں کو انسانیت کا مجرم خیال کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کے عملی تجربے نے اس نظامِ حکومت کو فی الواقع ایسا ثابت کیا ہے یا وہاں کے مفکرین و مدبرین کسی اور نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ان مفکرین و مدبرین سے مراد ان ممالک کے اربابِ فکر و سیاست ہیں جہاں جمہوری نظام قائم ہے۔

کچھ عرصہ ہوا لندن یونیورسٹی کے پروفیسر الفریڈ کوبن (ALFRED COBBAN) نے ایک عمدہ کتاب لکھی تھی جس کا نام ہے (THE CRISIS OF CIVILISATION) وہ اس کتاب میں تہذیبِ مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا سبب ان کا جمہوری نظام ہے (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اس میں "حاکم اور محکوم" میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پروفیسر کوبن اس مفروضہ کے متعلق لکھتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی

> اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادی اختیارات پیدا کر دیتا ہے۔[1] (صفحہ ۶۶)

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C.EWING) نے ۱۹۴۷ء میں ایک کتاب بعنوان (THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) شائع کی تھی جس میں اس نے ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ بحث کے دوران میں وہ کہتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ نظامِ جمہوریت میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ خود اپنے اوپر آپ ظلم نہیں کریں گے نہ اپنے حقوق خود غصب کریں گے۔ لیکن

> اگر روسو عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (صفحہ ۱۱۶)

فرانسیسی مفکر رینی گوئن (RENE GUENN) اس باب میں لکھتا ہے۔

---

[1] اس مقالہ کے تمام اقتباسات میں نے اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" سے لئے ہیں۔

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ جو کبھی نہ پہلے وجود میں آئی ہے اور آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں..... عام رائے دہندگی (UNIVERSAL SUFFRAGE) کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے (اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے (THE CRISIES OF THE MODERN WORLD .P. 106)

آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ مفکرین، جمہوری نظام کی جس خرابی پر اس شد و مد سے تنقید کر رہے ہیں اس نظریہ کا یہ مفروضہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (یعنی قانون سازی کا لامحدود اور غیر مشروط حق) عوام کو حاصل ہے اور عوام کا یہ حق ان کے نمائندوں کی اکثریت کی وساطت سے بروئے کار آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس نظریہ کی رُو سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ملک کے نمائندگان کی اکثریت جو قانون بنائے وہ ملک کے تمام افراد کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اور ہر حال میں حق و صداقت پر مبنی۔ ان مفکرین کے نزدیک، یہ اس نظریہ کی بنیادی کمزوری ہے۔ اور تباہی کا باعث۔ اس ضمن میں پروفیسر (H.L. MENCKEM) اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں لکھتا ہے۔

سب سے بڑی ناکامی

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب انھیں عملاً بروئے کار لانے کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور ارباب حکومت پبلک کے خدام ہیں۔ لیکن عملاً دیکھئے تو حکومت اپنا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب سمجھتی ہے..... اس باب میں مختلف اسالیب حکومت میں سب سے زیادہ ناکام جمہوری نظام رہا ہے۔ جمہوری نظام کے ارباب حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد مقبولیت

> پر ہونی چاہیئے۔ لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسندی نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کی وساطت سے جو حقیقتہً پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، نامحدود عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۳۳)

U.N.O کی تحقیق

سنہ ۱۹۴۷ء میں، اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ وہ جمہوری اندازِ حکومت کے متعلق سائنٹفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین و مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے۔ اور انھیں ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا جس کا نام (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) ہے۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پوچھا تھا کہ ڈیماکریسی کا مفہوم کیا ہے۔ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بالکل مبہم ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "دورِ حاضر میں لفظ جمہوریت سے زیادہ مہمل لفظ کوئی اور ہے ہی نہیں۔" (صفحہ ۴۶) اس کے بعد اس رپورٹ میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

> یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اکثریت کے فیصلے کو بدلوا دے۔ (صفحہ ۵۰۲)

سابقہ صفحات میں ہم نے جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ دنیا میں اس وقت جو مختلف نظامِ حکومت رائج ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی اور نظام، جمہوریت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ بالکل نہیں۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی فکر نے اپنی ساری تاریخ میں جو نظام سب سے بہتر تجویز کیا تھا، تجربے نے اس کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وہ بڑا ہی ناکام رہا ہے۔ دنیا کے دیگر نظام ہائے سیاست کی طرح، اس نظام کی بنیادی خرابی بھی یہ ہے کہ اس میں حق اور باطل، غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے مستقل (PERMANENT) خارجی (OBJECTIVE) اور مطلق (ABSOLUTE) معیار کوئی نہیں۔ اس میں عوام کے نمائندگان کی اکثریت کا فیصلہ قانون بن جاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے۔

اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے کوئی مستقل خارجی معیار نہ ہو اور قوم کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بن جائیں، تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ سوال واقعی غور طلب ہے، بالخصوص اس لئے کہ ایک سیکولر حکومت اور قرآنی نظامِ مملکت میں بنیادی طور پر یہی مقامِ افتراق (POINT OF DEPARTURE) ہے۔ سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے رکھیئے کہ قوم کے عام افراد ہوں یا ان کے نمائندے۔ نمائندوں کی اکثریت ہو یا اقلیت۔ یہ ہوں گے تو بالآخر انسان ہی۔ اور جو کمزوری ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ انسانوں کے گروہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا ناممکن ہے، اور جو ایسا فرض کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت ان امیال و عواطف اور کشش و جاذبیت سے مبرّیٰ ہو جائے گی جو ایک انسان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ لارڈ رسل

(LORD SNELL) کے الفاظ میں۔

حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوں گی اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جائیں گی جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔ (THE NEW WORLD -P.17)

آلڈوس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) اس باب میں لکھتا ہے۔

تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گذرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آیا ہے وہ آج نہیں ہوگا۔ یا آئندہ بھی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔ (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE-P.41)

اس لئے اگر اکثریت کو بھی بلا حدود و قیود آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے ہاتھوں، دوسرے انسانوں کے حقوق کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ کچھ تو ہوگا اپنے ملک کے اندر رہنے والے انسانوں کے ساتھ۔ جہاں تک دوسرے ملکوں کے انسانوں کا تعلق ہے انھیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس وقت دنیا کے باشندے مختلف قوموں (NATIONS) میں بٹے ہوئے ہیں نیشنلزم بحیثیت ایک سیاسی عقیدے کے، دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ یا کم از کم یوں کہیئے کہ اس زمانے میں اسے خاص طور پر فروغ حاصل ہوا ہے اور مغرب کو اس پر بڑا ناز ہے۔ لیکن نیشنلزم کے عملی تجربہ کے بعد، خود مغرب کے مفکرین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اب راز کی بات نہیں رہی۔ پروفیسر کوہن، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے۔

نیشنلزم کی تباہیاں

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حقِ خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حقِ خود مختاری کی مدعی ہوں۔

(THE CRISIS OF CIVILISATION-P.166)

تاریخ قومیت کا عالم (FRADRICK HERTZ) اپنی کتاب (NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS) میں لکھتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنھوں نے اپنے اپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی یا ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۸)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD) میں لکھتا ہے۔

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ہمارے زمانے میں نیشنلزم کی حیثیت ایک سیاسی نظریہ ہی کی نہیں رہی۔ اس نے ایک عقیدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آلڈس ہکسلے کے الفاظ میں،

> نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔ (THE PERENNIAL PHILOSOPHY-P.P. 184 and 203)

حب الوطنی کا جذبہ

نیشنلزم کے مذہب بن جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت پرستی (PATRIOTISM) سب سے بڑی نیکی اور جذبۂ حب الوطنی سب سے بلند جوہر قرار پا چکا ہے۔ اس مذہب کا "کلمہ" یہ ہے کہ MY COUNTRY —— RIGHT OR WRONG "میرا ملک حق پر ہو یا باطل پر، میں بہرحال اس کا ساتھ دوں گا۔"

RUMELIN کے الفاظ میں

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز۔
> (QUOTED BY MURRAY IN—THE INDIVIDUAL AND THE STATE-P. 216)

یہی وجہ ہے کہ والپول نے کہا تھا کہ

> نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔
> (QUOTED BY SUSAN STEBBINGS IN—IDEALS AND ILLUSIONS -P. 14)

اور لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رو سے طے نہیں پایا کرتے۔" (ایضاً ص۱۳) یہی وجہ ہے کہ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اب دنیا میں،

> پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار، رحم دل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا ہوتا ہے جسے "

اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS -P.730)

اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبر (GOVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ۔

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

(FOREIGN AFFAIRS - YEAR 1952)

حاصلِ مبحث

جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں لکھا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرانا چاہیں تو بات یوں سامنے آتی ہے کہ

(۱) انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔

(۲) مل جل کر رہنے سے ان کے مفادوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور ٹکراؤ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) اس مقصد کے لئے کہ مختلف افراد کے مفادوں میں ٹکراؤ نہ ہو اور اگر ٹکراؤ ہو تو اس سے جھگڑے پیدا نہ ہوں، سیاسی نظام کا تصور پیدا ہوا۔

(۴) انسانی فکر نے آج تک جس قدر سیاسی نظام وضع کئے ہیں ان میں کوئی بھی اس مقصد کے لئے کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

(۵) ان نظاموں میں آخری نظام قومی جمہوریت ہے۔ لیکن یہ نظام بھی بری طرح ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اول تو اس سے ملک کے اندر مختلف پارٹیوں میں باہمی کشمکش رہتی ہے۔ اور دوسرے مختلف ملکوں اور قوموں میں نفرت اور رقابت کے جذبات دنیا کو جہنم بنائے رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسانی فکر نے ان مشکلات کا بھی کوئی حل سوچا ہے۔ اور اگر سوچا ہے تو وہ کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں کیا موانع ہیں؟

مفکرینِ مغرب کیسا نظام چاہتے ہیں؟

ہم نے دیکھا ہے کہ نظامِ جمہوریت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے حرفِ آخر تصور کئے جاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر کوہن لکھتا ہے۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائے گی۔ یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے۔ نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی..... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ منشائے عوامی (GENERAL WILL) ہمیشہ صحیح ہوگا ورنہ وہ منشائے عوامی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت

اخلاقی معیار

کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ (جب منشائے عمومی، اُس وقت منشائے عمومی کہلا سکے گا جب وہ صحیح بات کہے تو) پھر یوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی معیار کے مطابق صحیح ہے وہی صداقت ہے (خواہ اُس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے)۔ (صفحہ ۷۶)

پروفیسر کوبن کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار "اخلاقی بنیادیں" ہیں، نہ کہ اکثریت کے فیصلے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب لاک نے جمہوریت کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے پیشِ نظر بھی ایک "ابدی قانون" کا عملی نفاذ تھا جسے وہ "قانونِ فطرت" سے تعبیر کرتا تھا۔ چنانچہ اس باب میں اس نے کہا تھا کہ

کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ قانونِ فطرت وہ ابدی قانون ہے جو تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ خواہ وہ قانون ساز ہوں یا قانون کے تابع۔

(CF. MABBOTT-THE STATE AND THE CITIZEN-P.25).

قانونِ فطرت

لاک کے نزدیک قانونِ فطرت خدا کا بنایا ہوا ہے اور انسان اس کے ماتحت اُس وقت رہا کرتے تھے جب وہ تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھے اور "نیچر" کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اُس وقت لوگ عقل (REASON) سے کام لیتے تھے، جذبات سے نہیں۔ لیکن بعد میں جب لوگ جذبات کے پیچھے لگ گئے تو ان کی زندگی قانونِ فطرت کے مطابق نہ رہی۔ اب اسی قانون کی بازیابی اور اس کی عملی تنفیذ انسانی معاشرہ کا فریضہ ہے۔ لیکن اتنا کچھ لکھنے کے بعد، لاک یہ کہتا ہے کہ یہ قانون اکثریت کی منشا سے مل سکتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا مفکر کس طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی نقطے کے گرد ناکام چکر کاٹ رہا ہے؟ وہ انسانی فیصلوں کی غلطیوں اور مفاد پرستوں کی چیرہ دستیوں سے گھبرا کر پکار اٹھتا ہے کہ "کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ اسے فطرت کے ابدی قانون کا پابند رہنا ہوگا۔" اور جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ فطرت کا وہ ابدی قانون کہاں سے ملے گا تو اسے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوجھتا کہ "یہ قانون اکثریت کے فیصلوں میں ملے گا۔" بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے پناہ لینا اسے ہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ہیں بھی سچے۔

لاک کی غلطی

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

بہرحال، ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغرب کے مفکرین اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلوں کو بہرحال و بہرکیف صحیح سمجھنا غلط ہے۔ کسی فیصلہ کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کسی خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ لاک کے نزدیک یہ خارجی معیار "قانونِ فطرت" ہے۔ پروفیسر کوبن اسے "اخلاقی معیار" سے تعبیر کرتا ہے۔ مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZEINI) نے اس باب میں کہا تھا:

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں

جس میں وحدت عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو یا زیادہ۔ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے

خدا کا قانون

پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا...... یاد رکھیے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(QUOTED BY GRIFF TH IN "INTERPRETTERS OF MAN"-P.46)

یعنی میزنی کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار قوانینِ خداوندی ہونے چاہئیں جن کا نافذ کرنا حکومت کا فریضہ قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی مذہب کے ہاں سے مل سکتے ہیں۔ لیکن یورپ میں جو مذہب (عیسائیت) رائج ہے پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اس کی حالت یہ ہے کہ

قوانینِ خداوندی عیسائیت سے نہیں مل سکتے

عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دُنیا ہے۔ اُخروی دنیا خیرِ محض کی مظہر ہے۔ اس کے برعکس یہ دنیا شر و فساد کی دنیا ہے۔ اُس دنیا کی حیات ابدی ہے۔ یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کے لئے یہ دنیا اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقام ہے۔ اس دنیا میں کوئی شے بالکلیہ خیر اور طیب نہیں۔ یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اسی صورت میں اچھا ہے جبکہ وہ ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن سکے جس کا وعدہ اگلی دنیا میں کیا گیا ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MARALS AND POLITICS -P.127)

ہسپانوی پروفیسر DR. FALTA DE GRACIA اس باب میں لکھتا ہے۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی چیز ہے...... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(QUOTED BY BRIFAULT IN-THE MAKING OF HUMANITY -P.334)

مشہور مفکر، پروفیسر وہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURES OF IDIAS -P. 18)

انہی حقائق کے پیشِ نظر تہذیب کا مشہور (امریکی) مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔ "اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔" یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صـ۴۴۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مذہب سے کبھی وہ خدائی قوانین نہیں مل سکتے تھے جنہیں میزانی نے صحیح اور غلط کا ناقابلِ تغیر معیار قرار دیا تھا۔ اب یورپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ یہ دروازہ مجلسِ اقوامِ متحدہ (U.N.O) کا تھا جس نے "انسانیت کے بنیادی حقوق" کے متعلق تحقیق و تعیین کے لئے ایک کمیشن بٹھایا اور اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق، ۱۹۴۸ء میں "منشورِ حقوقِ انسانیت" (DECLARATION OF HUMAN RIGHTS) شائع کیا۔ اس میں ان حقوق کی فہرست دی گئی جو اقوامِ متحدہ کے نزدیک ہر حکومت میں ہر فردِ انسانیہ کو حاصل ہونے چاہئیں۔ اقوامِ متحدہ کے اس کارنامے کو عصرِ حاضر کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا کے ستائے ہوئے انسان کی ڈھارس بندھ سکتی تھی کہ اسے کسی طرح کچھ حقوق کی مستقل ضمانت تو ملی لیکن اس کی یہ توقع بھی غلط نکلی۔ ابھی مذکورہ صدر منشور زیرِ ترتیب ہی تھا کہ (UNESCO) (یعنی انجمن اقوامِ متحدہ ہی کے ایک ادارہ) نے دنیا کے مشہور اربابِ فکر و نظر کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آرا سے مطلع کریں۔ ان کے جوابات مسٹر (JACQUES MARITAIN) کے تعارف کے ساتھ ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیے گئے تھے۔ ان حقوق کی حیثیت کے متعلق سب سے پہلے خود مسٹر میری ٹین لکھتے ہیں۔

یہ حقوق بھی غیر متبدل نہیں

یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق انسانی حقوق ہیں۔ اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عاید کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدیل قرار دیا جائے۔ (صـ۱۵)

اس کے بعد ماڈرن کوارٹرلی لندن کا ایڈیٹر (JOHN LEWIS) اپنے مقالہ کی ابتدا ان الفاظ سے کرتا ہے۔

اس حقیقت کو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کے متعلق یہ تصور کہ یہ حقوق مطلق ہیں اور فطرتِ انسانی کے اندر مضمر ہوتے ہیں اور ان کی ابتدا اس زمانے سے ہوتی ہے جب انسان نے ہنوز معاشرہ کی طرح بھی نہیں ڈالی تھی، ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صـ۵۱)

شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (GERARD) لکھتا ہے۔

انسانی حقوق صرف اس کوشش کا نام ہیں کہ انسان اور اس کے معاشرہ کے باہمی تعلقات کو متعین کر دیا جائے۔ یہ

حقوق نہ تو مطلق ہوتے ہیں نہ ایسے کہ انہیں ہمیشہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دیا جائے۔ (ص ۲۰۰)

یعنی جو کچھ آئینی کاوشوں اور کوششوں کے بعد انسان کو ملا، اس کے متعلق بھی اسے اطمینان نہیں کہ اسے وہ مستقل طور پر ملتا رہے گا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ حقوق کے تحفظ کے متعلق مسٹر (MARITAIN) نے لکھا ہے۔

انسانیت کے حقوق کی تعریف نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو "فلسفۂ زندگی" کہتے ہیں۔ (ص ۷۷)

اسی حقیقت کو پروفیسر جوڈ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے۔ بنابریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ

مستقل اقدار کی تلاش یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ یہ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS-P.906)

یعنی بات سمٹ سمٹا کر یہاں پہنچی کہ انسانی معاشرہ کی اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کے باہمی معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوں اور یہی اقدار غلط اور صحیح کا معیار قرار پائیں۔ یہ ہے وہ آخری منزل جس تک انسان اپنے ہزاروں سال کے ناکام تجارب کے بعد پہنچا ہے لیکن اس منزل میں پہنچکر بھی انسان ششدر و حیران کھڑا ہے کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مستقل اقدار ملیں گی کہاں سے؟ وہ اپنے ذہن سے کچھ اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک کی تردید دوسرا کر دیتا ہے۔

انسان کو اس مقام پر چھوڑ کر اب دیکھئے کہ خدا اس باب میں کیا کہتا ہے۔

باب دوم ——— خدا نے کیا کہا؟

قرآن کریم اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی تمدنی زندگی ناممکن ہو جائے۔ اس لئے

انسان کیسا واقع ہوا ہے؟ کہ انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے (وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔ ۱۸/۵۴) یہ بڑا بے صبرا ہے (إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا۔ ۷۰/۱۹) تنگ نظر ہے (وَكَانَ الْإِنسَانُ قَتُورًا۔ ۱۷/۱۰۰) جلد باز ہے (كَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا۔ ۱۷/۱۱) مال و دولت کی محبت میں بڑا متشدد ہے (وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ۔ ۱۰۰/۸) چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی دولت اسی کے پاس سمٹ کر آجائے (وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ ۸۹/۲۰) وہ دولت سمیٹتا چلا جائے اور پھر اسے گرہ میں باندھ کر رکھ لے (وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ۔ ۷۰/۱۸) اور اسے اس طرح روک کر بیٹھ جائے کہ کسی اور تک نہ

پہنچنے پائے (وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۔ ۷۰/۲۱) واضح رہے کہ جب قرآن "انسان" کے متعلق یہ کچھ کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہ نہیں کہ انسان کی فطرت بد واقع ہوئی ہے۔ قطعاً نہیں۔ (انسان کی فطرت کوئی نہیں۔ یہ سادہ لوح لے کر آتا ہے) اصل یہ ہے کہ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہر ذی حیات کا طبعی جذبہ ہے۔ ہر جاندار زندہ اور

انسان بدفطرت نہیں

باقی رہنے کے لئے انتہائی جد و جہد کرتا ہے۔ انسان کے علاوہ جتنے ذی حیات ہیں فطرت نے ان کی جد و جہد کا دائرہ خود محدود کر دیا ہے اسے ان کی جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ کسی جاندار کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے اس دائرہ سے باہر نکل سکے۔ اس لئے حیوانات کی دنیا میں فساد انگیزی نہیں ہوتی۔ لیکن انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ اپنے جذبات کی تسکین کے سلسلہ میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ۔۔۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی ۔۔۔ جنھیں نپٹانے کے لئے نظامِ سیاست کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

سابقہ باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کے سپرد "جھگڑے نپٹانے" کا کام کیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو محکوم۔ اس کے بعد اقتدار کی لذت انھیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی حکومت کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جائیں۔ اور ایسے اقدامات کریں جن سے حکومت ان کے ہاتھوں سے کبھی چھننے نہ پائے۔ قرآن نے، ایک انسان پر دوسرے انسان کی حکومت کے تصور کو باطل قرار دینے کے لئے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو (یکساں طور پر) واجب التکریم پیدا کیا ہے۔" اس لئے کسی انسان کو اس کا حق حاصل

کسی انسان کو حکومت کا حق نہیں

نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حاکم اور دوسروں کو محکوم سمجھے۔ اور اس طرح اوروں سے اپنا حکم منوائے مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ ...... (۳/۷۸) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین اور فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ ....." لہٰذا پہلی بات یہ ہے کہ قرآن، انسانوں کو حقِ حکومت دیتا ہی نہیں خواہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہوں؟ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ نظامِ حکومت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کی ضرورت سمجھتا ہے ۔۔۔ بلکہ اسے لازمی قرار دیتا ہے ۔۔۔ لیکن کہتا یہ ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ۔ حکومت صرف اللہ کی ہو سکتی ہے۔ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ اس

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ یہی نظامِ زندگی سیدھا اور متوازن ہے۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۱۲/۴۰) "لیکن انسانوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔" خدا اپنے اس حقِ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۱۸/۲۶)

لیکن خدا تو ایک مجرد حقیقت (ABSTRACT REALITY) ہے۔ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ نہ اس کی آواز سن سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اس سے کس طرح کرا سکتے ہیں؟ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے اس نے

خدا کی حکومت کتاب اللہ کی رُو سے

بتادیا کہ یہ فیصلے اُس ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کئے جائیں گے جسے اس نے رسول اللہ پر نازل کیا تھا۔ اس ضمن میں خود نبی اکرمؐ کی زبان سے کہلوا دیا کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ..... (۶/۱۱۵)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں، حالانکہ اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہٰذا خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت کی جائے جنھیں اس نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ ان قوانین کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اس کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)

تم صرف اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور اس کے سوا کسی سرپرست کا اتباع مت کرو۔ (لیکن) تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

لیکن کتاب کے اندر لکھے ہوئے قوانین محض نظری (THEORETICAL) حیثیت رکھتے ہیں اور متنازعہ فیہ امور میں کبھی فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک انھیں عملاً نافذ کرنے والی کوئی اتھارٹی موجود نہ ہو۔ قرآن نے سب سے پہلے خود رسول اللہ کو ایسی

زندہ اتھارٹی

اتھارٹی قرار دیا (اور ظاہر ہے کہ حضورؐ کی موجودگی میں کوئی اور اتھارٹی ہو نہیں سکتی تھی) اور آپؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دے دیا۔ (وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ ۴/۸۰ ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ اور اس نظام کی اہمیت کو ان الفاظ میں اجاگر کر دیا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۴/۶۵)

تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں (اے رسول) تجھے اپنا ثالث مقرر نہ کریں اور پھر تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں بلکہ اسے اپنے دل کی پوری رضامندی سے قبول کر لیں۔

ایک طرف، جماعت مومنین (یعنی مملکتِ اسلامی کے افراد) سے یہ کہا اور دوسری طرف رسول اللہ (یعنی فیصلے دینے والی اتھارٹی) سے تاکید کر دی کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ ان کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کر۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸) جب حق تیرے پاس آچکا ہے تو ان لوگوں کے خیالات کی پیروی مت کر۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن نے جو نظامِ سیاست متعین کیا ہے، اس کی رُو سے حکومت کی مرکزی اتھارٹی کو بھی

اس کا حق حاصل نہیں کہ

(۱) وہ تنازعہ فیہ امور میں لوگوں سے اپنا حکم منوائے۔ یا

(۲) ان قوانین کے خلاف فیصلے دے جو کتاب اللہ میں مذکور ہوں۔

بالفاظ دیگر اُس اتھارٹی کا کام قوانین سازی نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) قانون سازی کے آخری اختیار کو کہتے ہیں، تو قرآنی نظامِ سیاست میں اس قسم کا اقتدار نہ عوام کے منشاء (GENERAL WILL OF THE PEOPLE) کو حاصل ہوتا ہے، نہ ہی کسی خاص فرد کو۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کی عملی مظہر اس کی کتاب ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس نظام میں کسی کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اس میں سب سے بڑی اتھارٹی بھی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتی ہے، خدا کے نام پر اپنا حکم نہیں چلاتی۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ ..... (۱۰/۱۰۹) "جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کی پیروی کر..... یہ خدائی اختیارات" کا تصور قرآنی نظام سے کس قدر دُور ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو کسی نے انہیں خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا۔ اس پر آپ نے اُسے فوراً ٹوک دیا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں خلیفۃ الرسول ہوں۔ خود رسول اللہ نے بھی کبھی اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ نہیں کہا۔ اسلامی حکومت قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے والی اور بندوں کے متعلق جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں انہیں پورا کرنے والی ہوتی ہے۔ خدا کی قائمقام نہیں ہوتی۔ خدا کی قائمقامی کا تصور، تھیاکریسی کا پیدا کردہ ہے جو قرآن کی رُو سے باطل ہے۔

غیر متبدل اصول

چونکہ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے تمام نوعِ انسان کا ضابطۂ حیات قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں (بجز چند مستثنیات) صرف اصولی قوانین دیئے گئے ہیں، ان کی جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان اصولوں کے متعلق کہدیا کہ یہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۱۱۵) "تیرے رب کی بات عدل اور سچائی کی حیثیت سے مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں (قوانین) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اس لئے کہ یہ قوانین معاذ اللہ کسی اندھی قوت یا بے خبر انسان کے بنائے ہوئے نہیں۔ یہ اس کے متعین کردہ ہیں جو) سب کچھ سننے والا اور ہر بات کا جاننے والا ہے۔" انہی "کلمات اللہ" (قوانینِ خداوندی) کو غیر متبدل اصول (UN-ALTERABLE PRINCIPLES) یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ ان میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا۔ کسی پارٹی کی اکیاون آراء تو ایک طرف، پوری نوعِ انسانی کی سو فیصدی آراء بھی ان میں کسی قسم کی کمی بیشی یا ردوبدل نہیں کر سکتیں۔ انہی غیر متبدل اصولوں کو حدود اللہ کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حدود (BOUNDARY LINES) کے اندر رہتے ہوئے، افرادِ مملکت کے مشورے سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی

مشاورتی نظام احکام مرتب کرے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) ان معاملات میں لوگوں سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن اس مشاورت کی کوئی خاص شکل تجویز نہیں کرتا۔ اس کے لئے اسلامی مملکت اپنے زمانے کے تقاضے اور اپنے حالات کے مطابق جس قسم کا انتظام مناسب سمجھے تجویز کرلے۔ قرآن کا مقصد صرف مشاورت سے ہے مشاورتی مشینری سے نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی نظامِ سیاست میں قوانین سازی کے اختیارات قرآن میں بیان کردہ غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر محدود ہوں گے۔ یہ چاردیواری غیر متغیر رہے گی اور اس کے اندر اُمت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنے لئے خود جزئیات متعین کرے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس نظام میں نہ تو انسانوں کو ایسے غیر محدود اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنی من مانی کرسکیں اور نہ ہی ان کی آزادی کو اس طرح سلب کرلیا گیا ہے کہ وہ اپنے معاملات کے متعلق کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ اس نظام میں امت کی حیثیت فٹ بال کے میدان میں ٹیم کی سی ہوتی ہے کہ وہ میدان کی چاردیواری (BOUNDRY LINES) کے اندر رہتے ہوئے پوری آزادی کے ساتھ کھیل کھیلیں۔ اور باہمی تعاون سے زندگی کے بال کو اس کے گول (نصب العین) تک لے جائیں۔ یہ ہے قرآنی جمہوریت کا صحیح تصور۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے یہ نظام سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا۔ لیکن چونکہ یہ کوئی عارضی نظام نہیں تھا بلکہ اسے تمام نوع انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس لئے قرآن نے اس کی صراحت کردی کہ یہ نبی اکرمؐ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہوجائے گا۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس کے نہیں کہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے پیغامبر ہو گذرے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) وفات پاجائے یا قتل کردیا جائے تو کیا تم پھر اپنی قدیمی روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟

چنانچہ امت سے کہدیا گیا کہ تم نے، رسول اللہ کی وفات کے بعد، اس نظام کو اسی طرح آگے بڑھاتے چلے جانا۔ یعنی قرآن کی متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے جزئیات کا تعین کرتے ہوئے۔ اسی نظام کی حامل امت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اسلامی جمہوریت وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کا نظامِ حکومت باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ اسی کا نام اسلامی جمہوریت ہے۔ اس جمہوریت میں۔

(۱) نہ تو مغربی ڈیماکریسی کے مطلق اختیارات ہیں جس میں کوئی اصول، غیر متغیر اور کوئی قدر مستقل نہیں۔ اس میں برسر اقتدار پارٹی کی اکثریت جو قوانین چاہے بنائے۔ جب جی چاہے ان میں ردوبدل کردے۔ اور جس وقت چاہے انھیں منسوخ کردے۔

(۲) نہ ہی اس میں ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ ہے کہ ایک فرد قوت کے زور پر ہر ایک سے اپنا حکم منوانا چلا جائے۔

(۳) نہ ہی اس میں تھیاکریسی ہے کہ کسی فرد یا جماعت کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھا جائے۔ اس میں مذہبی پیشواؤں کا وجود

ہی نہیں ہوتا۔ اور

(۱۷) نہ ہی اس میں یہودی شریعت کی سی جکڑ بندی ہے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کے لئے بھی غیر متبدل ابدی قانون موجود ہو اور اس "لوہے کے جوتے" سے پاؤں باہر نکالا ہی نہ جا سکے۔

مستقل ضمانت

اس نظام سیاست میں، ہر فردِ انسانیہ کو ایسے مستقل حقوق حاصل ہوتے ہیں جنہیں کوئی تبدیل یا منسوخ نہیں کر سکتا۔ حکومتیں قائم ہوتی رہیں اور بدلتی رہیں۔ افراد آتے رہیں اور جاتے رہیں۔ لیکن اس مملکت میں بسنے والے شہریوں کو (خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا مسلم) جو حقوق خدا کی طرف سے مل چکے ہیں، ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ کتنی بڑی ہے یہ ضمانت جو کسی مملکت میں افرادِ انسانیہ کو حاصل ہو اور کتنا بڑا ہے وہ اطمینان جو اس ضمانت سے میسر آئے۔ سب سے بڑا اطمینان یہ کہ اس میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے لئے اس مملکت کا ہر شہری اربابِ بست و کشاد کی طرف سے۔ بار بار یہ اعلان سُنے گا کہ

کلمۂ شہادت کے معنی

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ

میں اس کی شہادت دیتا ہوں۔ میں دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں۔ کہ دنیا میں خدا کے علاوہ کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں۔

اس میں اگر کوئی شریک ہو سکتا تھا تو خدا کا رسول ہو سکتا تھا، جس سے بلند تر ہستی کا تصور بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آ سکتا۔ لیکن

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں۔ دنیا کو پکار کر سنائے دیتا ہوں کہ

محمدؐ بھی خدا کا عبد (بندہ۔ محکوم) اور اس کا پیغامبر ہے۔

اور جب دنیائے انسانیت کی بلند ترین ہستیؐ کی یہ پوزیشن ہے تو کسی دوسرے انسان کو اس کا حق کب حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ نہ رسول اللہؐ نے کسی انسان کو اپنا محکوم بنایا۔ نہ ہم کسی انسان کو اپنا محکوم بنا سکتے ہیں۔ حضورؐ نے خود بھی احکام خداوندی کی اطاعت کی اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائی۔ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں ہمارا فریضہ بھی یہی ہے کہ ہم خدا کے قوانین کی خود بھی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کرائیں۔

لوگ اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ اسلامک آئیڈیالوجی کیا ہے۔ ایک فقرہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی آئیڈیالوجی ہے اس کا کلمۂ طیبہ۔ یعنی اس امر کا اعلان کہ اطاعت و محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہے، اور کسی کی نہیں۔

وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (۱۶۳/۶)

اس مقام پر یقیناً آپ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہو گی کہ اُن اصولوں کا تعارف کرایا جائے جنہیں قرآن غیر متبدل قرار دیتا ہے اور ان اقدار کو سامنے لایا جائے جنہیں وہ مستقل اور مطلق (PERMANENT AND ABSOLUTE) ٹھہراتا ہے اور جن کے نفاذ کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے۔ ان اقدار کی فہرست طویل ہے جسے ضمناً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن اس غرض کے لئے کہ ان اقدار کا کچھ نہ کچھ تصور (IDEA) ذہن میں آجائے ہم یہاں (تمثیلاً) دو چار کا ذکر کئے دیتے ہیں۔

پہلی مستقل قدر — تکریم آدمیت

سب سے پہلی قدر تو یہی ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس میں رنگ، نسل، زبان، ملک، قوم، مذہب، حسب، نسب، امارت، افلاس وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر انسان بہ حیثیت انسان عزت کا مستحق اور تعظیم کا سزاوار ہے۔ اس اصول کے بنیادی قدر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مملکت نہ کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے اور نہ معاشرہ میں ایسا نظریہ رائج ہونے دے سکتی ہے جس کی رو سے کوئی انسان (پیدائشی یا پیشہ وغیرہ کی) اضافی نسبتوں سے شریف یا ذلیل تصور کیا جائے۔ معاشرہ میں عزت کے مدارج، جوہر ذاتی کے مطابق متعین ہوں گے (وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۔ ۴۶/۱۹)

(۲) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التعزت سمجھنا۔ ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج کا تعین کرنا۔ کسی کے حقوق و واجبات (DUES) کو سلب نہ کرنا اور تمام امور کے فیصلے قانون کے مطابق کرنا، جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو۔ عدل کہلاتا ہے۔

دوسری مستقل قدر — عدل

یہ قرآن کی رُو سے دوسری مستقل قدر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ..... (۱۶/۹۰)۔ "اللہ عدل کا حکم دیتا ہے"۔ اسلامی مملکت عدل کا راستہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔

(۳) بعض اوقات (مثلاً کسی پیدائشی نقص یا حادثات کی وجہ سے) ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی کسی استعداد میں مستقل طور پر کمی واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دیگر ہم عصر افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کی اس کمی کا پورا کرنا احسان کہلاتا ہے۔ اس لئے

تیسری مستقل قدر — احسان

قرآن نے جہاں عدل کا حکم دیا ہے وہاں احسان کو بھی ایک غیر متبدل اصول قرار دیا ہے۔ چنانچہ جو آیت پہلے درج کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ اللہ عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیتا ہے۔ احسان کے معنی ہیں حسن قائم رکھنا۔ توازن برقرار رکھنا۔

چوتھی مستقل قدر — دشمن سے عدل

(۴) عدل کے متعلق قرآن نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ صرف "اپنوں" کے ساتھ ہی نہیں کیا جائے گا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل کیا جائے گا۔ ارشاد ہے

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵/۸) "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہر حال میں عدل کرو۔ یہ روش تقویٰ سے زیادہ قریب ہے"۔ یہ بھی قرآن کی رُو سے ایک مستقل قدر ہے۔

(۵) عدل کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے اور ہر شخص اپنے اعمال کے لئے خود جواب دہ ہو۔ اس کے لئے

پانچویں مستقل قدر — اپنا بوجھ آپ اٹھاؤ

قرآن نے کہا کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔ یہ قرآن کا بڑا جامع اصول ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

(۶) ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے یہ بھی ایک غیر متبدل اصول ہے۔ ہر ایک کو قانون کی اطاعت کرنی ہوگی لیکن کوئی بھی ایسا قانون وضع نہیں کیا جا سکے گا جو خدا کی مقرر کی ہوئی مستقل اقدار سے ٹکرائے۔

مستقل اقدار کے مطابق حکومت قائم کرنا کسی ایک فرد یا پارٹی کا کام نہیں ہوگا۔ اس میں پوری کی پوری اُمت شامل ہوگی

چھٹی مستقل قدر — نظم و نسق میں ہر ایک شریک ہوگا

اسی مقصد کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (۳/۱۱۰) "تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے باہر لایا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم سب کو قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دو اور قانون کی خلاف ورزی سے روکو"۔ اس سے دو باتیں واضح ہیں ایک تو یہ کہ اسلامی حکومت تمام افراد کی مشترکہ امانت ہوگی۔ اور دوسرے یہ کہ اس اُمت کی ہستی کی وجہ جواز (JUSTIFICATION FOR EXISTANCE) یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں نوعِ انسان کی بھلائی ہو۔

(۷) حکومت چلانے کا فریضہ تو تمام اُمت کا مشترکہ ہوگا لیکن اس کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ امورِ نظم و نسق صرف ان

ساتویں مستقل قدر — امانات نااہلوں کے سپرد نہ کرو

لوگوں کے سپرد کئے جائیں جو ان کے اہل ہوں۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ..... (۴/۵۸) "اللہ تمہیں اس امر کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں"۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔

آٹھویں مستقل قدر — رزق کی ذمہ داری

(۸) قرآن کی رُو سے اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور انہیں اس کی ضمانت دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) "ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری

اولاد کے رزق کے بھی۔

یہ بھی ایک بنیادی حق ہے جو تمام افرادِ مملکت کو یکساں طور پر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مملکت میں بدنظمی یا بے انصافی کی وجہ سے ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

حب الوطنی کا جذبہ (۹) یہ ظاہر ہے کہ اس نظامِ سیاست کی ابتدا کسی ایک خطۂ زمین سے ہوگی جس کی حفاظت تمام افرادِ مملکت کا اولین فریضہ ہوگا۔ اس حد تک ملک کی خیر منگالی (PATRIOTISM) ایک مستحسن جذبہ قرار پائے گا۔ لیکن قرآن کا منتہیٰ یہ ہے کہ اس نظام کو تمام عالمِ انسانیت تک پھیلا دیا جائے، اس لئے کہ اُس کی رُو سے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں ــــ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) ــ تمام انسان امتِ واحدہ ہیں ــــ اس کا مستقل اصول ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس نظام کو اس طرح پھیلایا جائے کہ نوعِ انسانی اس کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر خود بخود اسے اختیار کرتی چلی جائے۔ وہ اسے جبراً کسی سے نہیں منوانا چاہتا۔ اس لئے

عالمگیر انسانی برادری

لا اکراہ فی الدین کہ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶) (دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جا سکتی) اس کی طرف سے پیش کردہ مستقل اصول ہے۔ جو لوگ اس نظامِ زندگی کو اپناتے چلے جائیں گے، وہ ایک امت کے فرد بنتے جائیں گے۔ جو اس کے خلاف کوئی دوسرا نظام تجویز اور اختیار کریں گے وہ دوسری قوم کے افراد ہوں گے۔ قرآن کی رُو سے قومیت کی تشکیل کا یہ معیار (یعنی آئیڈیالوجی) بھی ایک مستقل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح وہ چاہتا ہے کہ تمام انسان رفتہ رفتہ ایک قانون کے تابع آکر وحدتِ انسانیت کی زندگی بسر کریں۔ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی یہی وہ شکل ہے جسے علی پیکر میں دیکھنے کے لئے مغرب کے مفکرین اور مدبرین اس قدر آرزومند ہیں۔ چنانچہ پروفیسر کوتن اپنی اس کتاب کے آخری باب میں (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) لکھتا ہے۔

قومیت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی رو سے

> دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے (صفحہ ۲۲۵)

مسٹر EMERY REVES جس نے THE ANATOMY OF PEACE کے عنوان سے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب شائع کی ہے کہتا ہے۔

عالمگیر نظام

> ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے میل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم

کرنا چاہتی ہے۔ (صـــ۱۹۴ـــ)

مسٹر (REVES) دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

> کھلے کھلے الفاظ میں، بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد، انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے اسے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار متشکل ہوگا اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصد خون ریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اگر اس مقصد کا حصول اس طرح ممکن نہ ہوا تو پھر تاریخ کا فولادی ہاتھ مجبور کردے گا کہ ہم اور خونریزی کریں اور آج سے زیادہ مہلک آلات حرب و ضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو مغلوب کر کے وحدتِ اقتدار قائم کرے۔ (صـــ۲۳۳ـــ)

جس "اقتدارِ واحد" کے لئے مسٹر (REVES) کا دل اس قدر مضطرب و بیقرار ہے (اور دنیا کے ہر دلِ دردمند کو ایسا ہونا چاہیئے) اس کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے "لا الٰہ الا اللہ" کے انقلاب آفرین پیغام کے ذریعہ کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اس

واحد اقتدار

(کلمۂ توحید) کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام نوعِ انسانی کو واحد اقتدار کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور وہ "واحد اقتدار" کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا نہیں بلکہ خدا کا ہو سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یہ کہہ کر سمجھایا تھا کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹)۔ "کیا مختلف اقتدارات بہتر ہیں یا ایک خدا کا اقتدار جو بڑی قوتوں کا مالک ہے؟" قرآن کی رُو سے توحید کے معنی ہی وحدتِ اقتدار کے ہیں۔ اور شرک سے مفہوم ہے متعدد اقتدارات۔ اسی کے لئے اس نے کہا تھا کہ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ (۱۲/۴۰) "خدا نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔" اقتدار صرف اسی کا تسلیم کرو۔ اس کا یہ پیغام تمام نوعِ انسان کے نام تھا کسی خاص قوم، ملک، یا گروہ کے نام نہیں۔ قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ ـــــ ان سے کہہ دو کہ اے نوعِ انسان! جو نظامِ زندگی میں لایا ہوں اگر تمہیں اس کے سچا ہونے میں کوئی شک ہے تو (میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم ضرور اسے اختیار کرو۔ لیکن)۔ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ

یہی توحید سے مطلب ہے

يَتَوَفّٰىكُمْ ـــــ میں تو ان کا اقتدار تسلیم نہیں کر سکتا جن کا اقتدار تم، خدا کو چھوڑ کر اختیار کئے ہو۔ میں تو صرف اسی خدائے واحد کا اقتدار تسلیم کرتا ہوں جس کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ تمہاری موت و حیات تک بھی اُس کے اقتدار کے تابع ہے ـــــ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ـــــ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اُن لوگوں کے زمرے میں رہوں جو خدا کے اقتدار پر یقینِ محکم رکھتے ہیں ـــــ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰/۱۰۴-۱۰۵) ـــــ اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ تو ہر طرف سے منہ موڑ کر اسی

نظامِ زندگی کو اپنا نصب العین بنا اور مختلف اقتدارات کو اختیار کر کے شرکین میں سے مت ہو جا ـــــ یہی وہ وحدتِ اقتدار ہے جو اس عالمگیر نظامِ انسانی کی بنیاد بن سکتا ہے، جس کا تصور پروفیسر (HAROLD LASKI) کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا جب اس نے کہا تھا کہ

> دنیا میں اس وقت انسانی حالت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک عالمگیر نظام کی تشکیل کی جائے جس کے اراکین تمام دنیا کے افراد ہوں۔ (HUMAN RIGHTS-P. 91)

اور جس کے متعلق مسٹر (W. A. GAULD) نے اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں لکھا تھا کہ

> مجھے تسلیم ہے کہ "گھر اور وطن" کا خیال سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ایک عالمگیر انسانی معاشرہ کی رکنیت کا تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے...... ابھی تک اس عالمگیر نظام کا احساس کچھ زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے نہیں آیا اس لئے اس کے متعلق زیادہ حسنِ ظن قبل از وقت ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کم و بیش ہر ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے دل میں یہ خیال کروٹیں لے رہا ہے اس امر کی ضمانت ہے کہ کچھ وقت کے بعد یہ خیال عملی شکل اختیار کرے گا۔
>
> (صـ ۲۸۱-۲۸۴)

قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا نظام آخر الامر دنیا میں قائم ہو کر رہے گا ـــــ خون ریزی سے نہیں بلکہ ذہنی تبدیلی سے جو زمانے کے تقاضوں سے رفتہ رفتہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مسٹر (REVES) کا یہ خیال غلط ہے کہ جدید قسم کے آلاتِ حرب و ضرب سے کوئی ایک قوم باقی اقوام کو مغلوب کر کے، اپنا اقتدارِ واحد قائم کر لے گی۔ اب جو آلاتِ حرب و ضرب ایجاد ہو رہے ہیں اگر انھیں جنگ میں استعمال کیا گیا تو نہ قوم غالب باقی رہے گی نہ قوم مغلوب؛ پوری کی پوری نوعِ انسان تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے وحدتِ انسانیت کا عالمگیر نظام جو خدا کے اقتدارِ واحد کی بنیادوں پر استوار ہوگا، انسان کی داخلی تبدیلی سے ظہور میں آئے گا۔ یہی قرآن کا بتایا ہوا طریقِ کار (PROCESS) ہے۔ لیکن اس کا آغاز بہرحال کسی ایک خطۂ زمین سے ہوگا۔ وہ خطۂ زمین پاکستان کیوں نہ ہو؟۔

اگر ہم نے پاکستان میں قرآن کے سیاسی نظام کو رائج کر لیا۔ تو اس سے نہ صرف ہماری مشکلات ہی کا حل مل جائے گا بلکہ ساری دنیا کو اس جہنم سے نجات مل جائے گی جس میں وہ آج اس بری طرح سے گرفتار ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس ہم سے بھی پہلے مغرب کے مفکرین کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ چنانچہ عصرِ حاضر کا نامور مؤرخ، پروفیسر ٹوئن بی (A. J. TOYNBEE) اپنی کتاب (THE WORLD AND THE WEST) میں لکھتا ہے۔

> مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ایں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دوسرے اسلامی ممالک، نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں

کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلا لحاظِ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہو گا؟...... دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن یورپ کی تہذیب نے دوسروں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا ہے کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودّت و اخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ (ص ۳۱-۳۰)

آپ نے غور فرمایا کہ یہ غیر مسلم مفکر و مورخ ہمیں کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ ہم تو قومیت پرستی کے عذاب میں ماخوذ ہیں اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی (آسمانی) روشنی نہ تھی جو صحیح راستے کی طرف ہماری راہ نمائی کرتی۔ لیکن تمہارے پاس تو (تیرہ سو سال سے) ایک خداوندی روشنی تھی جو زندگی کے ہر دوراہے پر تمہاری راہ نمائی کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بھی ہم اندھوں کے پیچھے لگ کر جہنم کے طرف چل پڑے؟ تمہیں تو ہماری راہ نمائی کرنی چاہیئے تھی اور بتانا چاہیئے تھا کہ انسانیت کی نجات و سعادت، آئیڈیا لوجی کی بنیادوں پر عالمگیر برادری کی تشکیل میں ہے، نہ کہ رنگ۔ نسل۔ زبان۔ وطن کے اشتراک سے قومیت کے تصور پر! آئیڈیا لوجی کی بنیادوں پر ملت کی تشکیل ہمارے لئے کوئی نیا نظریہ نہیں۔ یہ تو دین کے ان اصولوں میں سے ہے جو خدا کی طرف سے اس زمانے سے ملنے شروع ہو گئے تھے جب انسان کو پہلے پہل دوگی کی راہ نمائی کی ضرورت پڑی تھی۔ یہی وہ تصور تھا جس کی رو سے حضرت نوحؑ کے بیٹے کے متعلق کہدیا گیا تھا کہ وہ باپ کے "اہل" میں سے نہیں ہے۔ اسی کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد (اور ساری قوم سے) کہہ دیا تھا کہ ان میں اور ان میں بُعد و مغائرت کی دیوار حائل رہے گی جب تک یہ خدائے واحد کی محکومی تسلیم نہیں کریں گے۔ اسی نظریہ کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کا شمار بے گانوں میں کیا گیا تھا۔ پھر آخر الامر اسی اصول کے مطابق، مکہ کے رہنے والے قریش، خود نبی اکرمؐ کے ہم قبیلہ (بنو ہاشم) بلکہ آپؐ کے قریب ترین رشتہ دار (حقیقی چچا وغیرہ)، اشتراکِ رنگ۔ نسل۔ زبان۔ وطن کے باوجود، ایک الگ قوم کے افراد قرار دیئے گئے تھے اور حبش کے بلالؓ۔ روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ اپنی برادری کے اخوان۔ لیکن آج اُسی دین کے نام لیواؤں کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کہیں نسل کی بنیادوں پر جداگانہ قومیت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ کہیں زبان کے اشتراک سے علیحدگی کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ کہیں وطنیت کی رو سے قوم ترتیب پا رہی ہے۔ ہم یہ کچھ کر رہے ہیں اور غیر مسلم ہمیں متنبہ کر رہے ہیں کہ تمہاری یہ روش تمہیں تباہیوں کی طرف لے جائے گی۔ تم اپنے ہاں عالمگیر برادری کے اسی تصور کو عام کرو جسے تمہارے دین نے انسانیت کی فوز و فلاح کے لئے تجویز کیا تھا!

ظاہر ہے کہ عالمگیر برادری اس صورت میں قائم ہو سکتی ہے جب تمام مسلم ممالک اپنے ہاں قرآنی نظامِ سیاست رائج کر لیں۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ امکان پاکستان میں ہے۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک میں کوئی نہ کوئی نظام پہلے سے رائج ہے۔ لیکن پاکستان نے اپنے لئے کسی نظام کو تجویز کرنا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس وقت ساری دنیا کی آنکھیں پاکستان کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ اسے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری　　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

خدا کرے کہ مملکتِ پاکستان دنیا کی اس حسین توقع کو پورا کر دکھائے جو اس نے اس کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہے۔

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

اسلام اور اسکے اہم حقائق

انتہائی سادہ، آسان فہم اور دلکش و شگفتہ انداز میں

مفکرِ قرآن جناب پرویز کی گرانمایہ قلمی پیشکش

سلیم کے نام خطوط

جلد اوّل ——— آٹھ روپے

جلد دوم ——— چھ روپے

ہر دو جلدیں حسین اور دیدہ زیب ٹائپ میں چھپی ہیں۔ مجلد اور رنگارنگ گرد پوش سے مزین ہیں::

مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

لغات القرآن

وہ کتاب جس کا برسوں سے انتظار تھا، بالآخر تیار ہوگئی۔ فللہ الحمد۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس معرکہ آراء کتاب کی پہلی جلد وسط اپریل تک شائع ہوجائے گی۔ یہ جلد پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوگی۔ یہ کرنافلی کے سفید کاغذ پر، نہایت عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے۔ جلد بہت پائیدار اور خوبصورت تیار کرائی جارہی ہے۔ اس جلد کی قیمت پندرہ روپے ہوگی۔ امید ہے پوری لغت چار جلدوں میں مکمل ہوجائے گی۔ باقی جلدیں بھی یکے بعد دیگرے چھپتی جائیں گی۔

یہ لغات نہیں

بلکہ قرآن کریم کا انسائیکلوپیڈیا اور "قرآن کی قرآن سے تفسیر" ہے۔ اس کے بغور مطالعہ سے پورا قرآن آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔

اپنے آرڈر جلد بھیجدیئے کیونکہ کتاب آرڈر پہنچنے کی ترتیب کے مطابق روانہ کی جائے گی :::

— قیمت —

پندرہ ۱۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵۔ بی۔ گلبرگ — لاہور

کیا آپ کو اتنی فرصت ہے؟

کہ آپ گذشتہ اڑھائی ہزار سال کے مختلف مفکرین۔ مؤرخین۔ سیاسی مدبرین۔ مذہبی مصنفین اور نامور سائنسدانوں کے خیالات کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ ان سب کا رجحان کس طرف ہے؟

آپ کو فرصت نہیں ہو سکتی

آپ کیلئے یہ کام اس معرکہ آراء کتاب نے کر دیا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتی۔

اس کتاب نے

اتنا ہی نہیں کیا کہ دنیا بھر کے آئمہ فکر و نظر کے خیالات یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی عقل کس طرح خدا کی وحی کی محتاج ہے۔ اس عجیب و غریب کتاب کا نام ہے۔

"انسان نے کیا سوچا؟"

جس کا تازہ ایڈیشن، بڑی آب و تاب کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ضخیم کتاب۔ سفید کاغذ۔ ٹائپ کی طباعت۔ حسین اور پائیدار جلد۔

قیمت ——— بارہ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ طلوع اسلام ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

سرسیّد احمد خانؒ

(۴)

(قومی تعلیمات کیلئے نفیرِ انقلاب)

(جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے) (اقبالؒ)

(از:- محترم صفدر سلیمی صاحب)

حیاتِ سرسید کے اجمالی تذکرہ کے بعد ہم اس کے دو اہم گوشوں کی تفصیل قارئین کے سامنے لا چکے ہیں۔ اس تفصیل کے دوران میں ہم نے اس عظیم رہنما کو پولیٹیکل کردار کی جولانگاہ میں جرأت و عزیمت کے پورے جاہ و جلال کے ساتھ تدبر و فراست کے پرچم اڑاتے دیکھا اور پھر ایک حکیمِ انقلاب کی حیثیت سے اس کے فکر و اجتہاد کی وہ انقلابی کاوشیں بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آئیں جنھوں نے مسلکِ تقلید کی خلوت گاہوں میں زلزلے ڈال دیئے۔ اور مذہبی جمود کی بساطِ کہن الٹ کر رکھ دی۔ اب کی بار ہمارے سامنے اس نقیبِ ملت کی وہ کشتِ نوبہار، شادابیٔ قلب و نظر کا سماں باندھتی آ رہی ہے جو علی گڑھ کے دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی کے دلکش اداروں کی صورت میں برگ و بار لائی۔ اور جہاں تک عوام کا تعلق ہے انھیں سرسید کے اسی کارنامے نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو سرسید کے پولیٹیکل کردار کی گہرائیوں اور اس کے دور رس نتائج کا کماحقہٗ جائزہ لینے کے قابل ہوں۔ بعینہٖ معدودے چند افراد ایسے ہوں گے جو ان کے فکر و اجتہاد کی اصولی اور انقلابی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی معقول صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عوام کی سطحی نگاہ اور جذباتی روش کو بالعموم فکر و نظر کی ان دور اندیشیوں تک رسائی نہیں ہوتی۔ وہ تاریخ کے بین السطور اور رفتارِ زمانہ کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے رموز و حقائق کا احاطہ بمشکل کر سکتی ہے اور انسانی عظمت کے ان گوشوں کو بے نقاب نہیں دیکھ سکتی جہاں ایک زعیم قوم کی بے تاب آرزوئیں خونِ جگر کی آبیاری سے پروان چڑھتی ہیں۔ انھوں نے تو ہمیشہ ایک

سالار انقلاب کے ان شاہکاروں پر تہنیت و تبریک کے پھول برسائے ہیں جو محسوس و مشہود پیکروں میں ان کی نگاہوں کے سامنے جلوہ بار ہوئے۔

عوامی نفسیات کی اس واضح حقیقت کی بنا پر ہمارے عوام کے نزدیک بھی سرسید کی عظمت و شہرت کا معیار وہی مرکز تعلیم و تربیت قرار پاتا ہے جس کی پُروقار عمارتیں اور پر بہار سبزہ زاروں میں انھوں نے اپنی قومی نشاۃ ثانیہ کی صبح بہار کو ابھرتے دیکھا۔ وہ اسی ایک سرسید کو جانتے اور پہچانتے ہیں جس نے تند و تیز ہوا اور اندھیری رات میں ان کے لئے دارالعلوم علی گڑھ کا چراغ روشن کیا۔ اسی سرچشمۂ نور کی تنویروں سے ان کے در و دیوار جگمگائے اور اسی کی کسب ضیا سے ہزاروں چراغ جلوہ بار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی وہ قومی محفلیں جو مدت سے جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن تک کے لئے ترس گئی تھیں از سر نو چراغاں ہو گئیں۔

ایک صدی کی مسلسل فکری و سیاسی تگ و تاز میں ہمارا کاروانِ شوق جن ارتقائی مراحل سے گذر کر زیر منزل تک پہنچا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اُن سے اس زعیم کے سیاسی اور اجتہادی شاہکاروں کی آب و تاب کافی ماند پڑ گئی ہو۔ اور بالخصوص ہمارے عوام آج ان نقوش کو نظر انداز کر چکے ہوں۔ لیکن جہاں تک علی گڈھ کے جیتے جاگتے شاہکاروں کا تعلق ہے یہ نہ تو ہماری آئندہ نسلوں کی نگاہ سے اوجھل ہو سکیں گے اور نہ مؤرخ کا قلم انھیں نظر انداز کر سکے گا۔ بلکہ اگر ہم سرسیدؒ کے سہانے خوابوں کی تعبیریں کر اس معراج کمال تک پہونچ بھی گئے جہاں ستاروں پر کمندیں پھینکی جاتی ہیں اور اقوام عالم کی امامت کا فریضہ ادا کیا جاتا ہے تو اُس مقام بلند سے بھی ہماری نگہ بازگشت بار بار علی گڈھ کے شہ نشان (LAND MARK) کو دیکھے گی اور جھوم جھوم کر آغاز سفر کی اُس لمحۂ نوازیاد کو تازہ کرے گی۔ آج ہم یہی کہیں گے کہ سرسید سے قبل اور ان کے بعد ایک رہنما ایسا نظر نہیں آتا جو اس میدان میں ان تک پہنچ سکے۔

سرسیدؒ کے ان تعلیمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری نگاہ ایک بار پھر ایک صدی قبل کے اس نازک مقام تک لوٹ جاتی ہے جب ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند کے پے در پے زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے تھے اور بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں مایوس نگاہیں کسی دستِ شفقت کا سہارا ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اسی محشرستان میں سرسیدؒ کی فراست و عزیمت نے ہماری بازآفرینی کا معجزہ سرانجام دیا اور یہ کیفیت نظر آنے لگی کہ

رگِ تاک منتظر تھی اسی بارشِ کرم کی

قومی زندگی کا یہی وہ نازک مرحلہ تھا جبکہ قوم کو نئے اور غیر ملکی حکمرانوں کی آتشِ غضب سے بچاتے بچاتے انتہائی تلخ تجربات کے سلسلہ میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک قوم جہالت کی تاریکیوں سے نجات حاصل نہیں کریں گی اور افرادِ ملت کے قلب و دماغ علوم جدیدہ کی روشنی سے منور نہیں ہوں گے اس کا زندہ قوموں کی قطار میں چلنا ممکن نہ ہوگا۔ ان کے نزدیک مرضِ کہن کا قطعی اور آخری چارہ یہی تھا کہ قوم اُن علوم سے بہرہ ور ہو جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں، اور ان کے دل و دماغ کی نشوونما اس انداز سے کر سکیں کہ وہ ترقی یافتہ اقوامِ عالم کے دوش بدوش منازلِ حیات طے کرنے کے قابل ہو جائے۔

اس دور کے حالات کو پیش نظر رکھئے تو یہی وہ نازک مقام تھا جسے طے کرنا ایک زعیم قوم کے لئے کڑی آزمائش کا درجہ رکھتا تھا جدید علوم کا تمام لٹریچر جو وقت اور حالات کے تقاضوں کو پورا کر سکتا اُس وقت انگریزی زبان میں تھا اور دوسری طرف مذہبی اجارہ

داروں کی مفاد پرستیوں اور مصلحت کوشیوں نے قدامت پسندی کے زیر اثر انگریزی تعلیم کو شجرِ ممنوعہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اور اسی کے زیر اثر مسلمان انگریزی تعلیم کو گناہِ عظیم کے ہم پایہ سمجھ بیٹھے تھے۔ انھوں نے کبھی اس تلخ حقیقت پر غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ جدید علوم کے مقابلے میں ان کے قدامت پسند اور مفاد پرست مذہبی پیشوا درس نظامی کے جس بوسیدہ نصاب کو ذریعہ نجات سمجھ کر سینے سے لگائے پھر رہے تھے وہ دین اور دنیا دونوں میں انسان کو ناکارہ بنا دیتا تھا۔ یہ نصاب قطعاً اس قابل نہ تھا کہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے اور ۱۸۵۷ء کی زخم خوردہ قوم کو عزت اور آبرو سے زندہ رہنے کے قابل بنا سکے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی تھی کہ وہ اس بے مقصد نصاب کو سرمایۂ دین سمجھ کر اسے مرجع عقیدت و احترام بنائے بیٹھے تھے اور اس فریب خوردہ عقیدت کی بنا پر ملائیت کے اس دامِ فریب کو سمجھنے سے قطعاً قاصر تھے کہ انگریزی تعلیم کو کفر قرار دے کر مسلمانوں کو علومِ جدیدہ کی روشنی سے محض اس لئے محروم کیا جا رہا ہے کہ کہیں اس کی روشنی میں اس کے صدیوں کے تانے بانے کا تار پود بکھر کر نہ رہ جائے اور وہ طلسمِ سامری ٹوٹ نہ جائے جس کے گرد تقدس کے کئی ہالے قائم کئے گئے تھے۔

سرسید کی بجائے کوئی اور ہوتا تو ہزاروں ملاؤں کے اس طوفانِ ہاؤ ہو سے خوف کھا کر جس کا شور آسمانوں تک سنائی دیا میدان چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لیتا اور ملت اس طلسمِ سامری کی گرفت میں ہچکیاں لے کر دم توڑ دیتی لیکن اسے مسلمانوں کی خوش نصیبی کہیئے کہ یہاں مقابلہ اس سرسید سے تھا جس کے فولادی عزم کے سامنے پہاڑ پانی ہو کر بہہ گئے اور تاریخ کا دھارا بدل گیا۔ اُس نے جس مقصد کو امت کے مرضِ کہن کا چارہ سمجھ لیا اس کے لئے دیوانہ وار میدان میں آیا۔ اور پھر نہ مخالفت کی تند و تیز آندھیاں اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے سے باز رکھ سکیں نہ حوادث کے لرزہ فگن طوفان سدِ راہ بن سکے۔ اُس نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ علومِ جدیدہ کو مشعلِ راہ بنائے بغیر نہ تو اس کی قوم زندہ قوموں کی صف میں کھڑی ہو سکتی ہے اور نہ زندگی کی شاہراہوں پر کسی خوش آئند سفر کا آغاز کر سکتی ہے۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہی اس نے یہ طے کر لیا کہ سب سے پہلے جدید علوم کے خلاف عوام میں پیدا کردہ نفرت اور وحشت کو دلولہ بھرے ذوق و شوق میں بدلے۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام

اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی علمی مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے جو فلسفہ و سائنس کے جدید ترین لٹریچر کو ملکی زبان میں ڈھال سکے۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں انھوں نے "سائنٹیفک سوسائٹی" کے نام سے اس علمی مجلس کی تاسیس کی اور ڈیوک آف آرگائل (وزیر ہند) کی سرپرستی میں اس سوسائٹی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ سرسید اس راہ کی کڑی آزمائشوں سے پوری طرح باخبر تھے اور ہر مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر۔ ان کے عزائم اور آرزوؤں کی جھلک مندرجہ ذیل سے واضح طور پر نظر آئے گی۔ یہ سرسید کے اُس مشہور آرٹیکل کا اقتباس ہے جو انھوں نے "ہماری ورنیکلر زبان" کے عنوان سے پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھا تھا اور سارے ملک میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ اس اقتباس میں وہ لکھتے ہیں۔

> ہمارے لئے یہ کھلا ہوا سیدھا راستہ ہے کہ ہم جہاں تک ہو سکے یورپین لٹریچر اور سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں..... بے شک ہم کو ایسا کرنے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ ادھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت

اور تعصب کا مقابلہ کرنا ہے اور اُدھر محمڈن قوم کے ان تنگ دل لوگوں کی مزاحمت کو برداشت کرنا ہے جو ہماری سوشل اور پولیٹیکل ترقی کو اپنی طبعی تنگدلی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہماری انگلش لائف۔ انگلش تمدن یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہے۔ مگر ہم کو اپنی اور صرف اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھی چاہیئے اور جو تکالیف اور مشکلات پیش آئیں نہایت تحمل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ ریفارمر (یعنی زمانہ) ان باتوں کو ضرور کرکے رہے گا اور کوئی مزاحمت کوئی ناخوشی و خفگی اس کو روک نہیں سکے گی۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے انگریزی لٹریچر کے اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام خوش اسلوبی سے جاری تھا۔ اور اس سے ایسے خوشگوار نتائج سامنے آرہے تھے کہ حکومت ہند کو بھی اس علمی جدوجہد کی کامیابی کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ ۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جو مکتوب سرسید کے نام موصول ہوا اس میں ان بلند بانگ علمی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہ لکھا گیا کہ

نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل ان تدبیروں سے خاص طور پر رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو سائنٹیفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے اختیار کی ہیں۔

علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء

سوسائٹی کے کام کی رفتار کو موثر بنانے کے لئے ۱۸۶۶ء میں سرسید نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا۔ سرسید اس اخبار کا افتتاحیہ بھی خود لکھتے تھے اور دیگر سوشل، پولیٹیکل اور علمی و اخلاقی مقالات بھی۔ اس اخبار نے شمالی ہندوستان میں بیداری کی لہر دوڑا دی اسے انگریزی حلقوں میں بھی بغور پڑھا جاتا تھا۔ اور حکومت ہمیشہ اس کی زوردار آواز پر کان لگائے رکھتی تھی۔ برادرانِ وطن اور برطانوی حکمران دونوں کے نزدیک یہ اخبار ہندوستان کے باشعور اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ترجمان قرار پایا۔ پورے بتیس برس مسلمانانِ ہند کے اس قومی آرگن کی تحریریں اذانِ سحر کا سا اثر پیدا کرتی رہیں۔ اور علوم جدیدہ کے حصول کا ذوق و شوق اس کی دعوت سے دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ "پلرز آف انڈین ایمپائر" کا مصنف اپنی اس کتاب میں علی گڈھ گزٹ کے قلمی کارناموں پر اظہارِ تحسین کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جو مسلمانوں کا خاص آرگن ہے اور جس کے ایڈیٹر سرسید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں، شمالی ہندوستان کا سب سے عمدہ اخبار ہے۔

اردو زبان کے خلاف برادرانِ وطن کی یلغار

عین اس وقت جبکہ سرسید اپنے ملک کے لئے یہ گرانمایہ خدمات انجام دے رہے تھے اور سوسائٹی کے دارالترجمہ میں مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ ماسٹر پیارے لال اور پنڈت دھرم نرائن جیسے ہندو فضلا بھی برابر شریک تھے۔ ہندو قوم کے کچھ سربرآوردہ افراد نے اردو زبان

کو مٹانے کی تحریک کھڑی کر دی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ مسلمان بغاوتِ ہند کی شکست کا خمیازہ بھگت رہے تھے اور ہندو انگریزی حکومت کے دفتری نظام میں حکومت کا حاشیہ بردار بن کر شریک ہو چکا تھا۔ صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ ٹھُڑدلی نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ کسی ہمسایہ قوم کو از سرِ نو اُبھرتے ہوئے دیکھے اور اسے گوارا کرلے۔ چنانچہ اردو زبان کے بجائے سرکاری دفاتر میں بھاشا کو رائج کرنے کی تحریک بھی اسی تنگدلانہ ذہنیت کا نشان تھی اور مقصد پیشِ نظر مسلمانوں کی اس تعلیمی بیداری کو ناکام بنانا تھا جو سرسیدؒ اور اُن کے رفقاء کی کوششوں سے ابھی بمشکل ابھرنا شروع ہوئی تھی۔ انھوں نے پہلے بنگالہ کے دفتری نظام سے اس زبان کو جلاوطن کرایا اور پھر صوبہ بہار سے۔ لیکن جب ان فتوحات کے بعد انھوں نے شمال مغربی اضلاع (یوپی) میں اس تحریک کو پورے زور و شور سے اٹھایا تو سرسید خم ٹھونک کر مقابلے میں آگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر تعلیمات کی پُرزور سفارش کے باوجود سر جان اسٹریچی کی حکومت نے ہندوؤں کے اس مطالبہ کو معقول وجوہات کی بنا پر مسترد کر دیا۔ ۱۸۸۲ء میں ہندوؤں نے ایک بار پھر ایجوکیشن کمیشن میں اُردو زبان کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ جواباً سرسید نے پوری قوت سے کمیشن پر واضح کر دیا کہ زبان کا مسئلہ موجودہ صورت میں ایک اہم اور پولیٹیکل مسئلہ ہے اور کمیشن کا اس بحث سے کوئی علاقہ نہیں۔ چنانچہ سرسید کی اس دلیل سے متاثر ہو کر کمیشن نے زبان کے مسئلہ پر خاموشی اختیار کی۔ لیکن یہ فتنہ موقع بموقع سر اٹھاتا چلا گیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس سیاسی چپقلش کا آغاز بن گیا جو بالآخر تقسیمِ ملک پر منتج ہوئی۔ سرسید نے شروع میں ایسی تلخیوں کو ختم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن بالآخر انھیں مایوسی کے عالم میں ایک دن کہنا ہی پڑا۔

> مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا یہ مخالفت اور عناد اُن ہندوؤں کے سبب اُبھرے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔

سرسید نے یہ الفاظ ۱۸۶۷ء میں کمشنر بنارس مسٹر شکسپیئر کے ایک سوال کے جواب میں کہے تھے اور دیکھئے کہ یہ پیشگوئی ٹھیک اسی سال بعد ۱۹۴۷ء میں حرفاً حرفاً کس طرح پوری ہوئی۔ اس وقت تک سرسید کی جد و جہد نے ملکی مفادات سے وابستگی قائم کر رکھی تھی لیکن برادرانِ وطن نے ان کی ملت کی باز آفرینی کے خلاف جس بُغض و عناد کا مظاہرہ کیا اور اسے زک پہنچانے کی جو کوششیں مسلسل جاری رکھیں ان سے سرسید کی جد و جہد کا رخ پوری طرح بدل گیا اور وہ سب سے بے نیاز ہو کر اپنی اور صرف اپنی قوم کے لئے وقف ہو گئے۔ اب ان کی زندگی کی منزلِ مقصود، ان کا نصب العین اور پیشِ نہاد یہ تھا کہ امکان کی آخری حد تک وہ اسلامیانِ ہند کے عروج و اقبال کے لئے اپنی جان لڑا دیں۔ اور سرسید کا یہ فیصلہ سچ پوچھئے تو ان کی پوری قوم کا فیصلہ بن گیا۔ انھوں نے برادرانِ وطن کے مقابلہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فکر و عمل کی مخصوص شاہراہ متعین کر لی اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی طاقت ان دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے شریکِ سفر نہ بنا سکی۔

انگلستان کا سفر

اب سرسید کے سامنے پہلا کام مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ اور اس کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ انگلستان پہنچ کر وہاں کے نظامِ تعلیم کا بنفسِ نفیس مشاہدہ کریں۔ اس دور کی ممتاز ترین اور جہانگیر

قوم کے نشو و ارتقاء کے سرچشموں کا بہ چشم خود جائزہ لیں اور پھر ان تجربات و مشاہدات کی روشنی میں قومی تعلیم و تربیت کا دستور العمل ترتیب دیں۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں وہ اپنے دونوں جگر گوشوں سید حامد اور سید محمود کو ساتھ لے کر عازم انگلستان ہو گئے۔ نواب محسن الملک ان کی روانگی کی کیفیت اور پیش نہاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> جب سرسید لندن جانے کو تھے تو مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ انھوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا۔ کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انھوں نے بارہا مجھ سے کہا کہ "میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کروں"۔

سرسید کم و بیش ڈیڑھ برس انگلستان میں رہے۔ انھوں نے وہاں کی یونیورسٹیوں کا معائنہ کیا۔ کالجوں کو دیکھا۔ طرزِ تعلیم کا مشاہدہ کیا۔ نصابِ تعلیم پر غور کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک بہت بڑا علمی و دینی کارنامہ بھی سرانجام دیا۔ یعنی وہاں کی لائبریریوں سے اہم کتب اور دستاویزات کے مطالعہ کے بعد سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں "خطباتِ احمدیہ" کی مشہور تصنیف بھی شائع کی۔

انگلستان کی نامور علمی مجلسوں اور ثقافتی اداروں نے ان کے اعزاز میں اجلاس کئے۔ بڑی بڑی اہم برطانوی شخصیتوں نے خاص تقریبات کا اہتمام کیا۔ کئی زعماء کے ہاں وہ ڈنر پر بلائے گئے۔ ان دعوتوں میں برطانیہ کے بڑے بڑے ڈیوک، لارڈز اور علمی و سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ انھیں اہم خطابات اور تمغوں سے نوازا گیا۔ انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف لندن اور انیتھم کلب جیسے شہرہ آفاق علمی اداروں کی اعزازی رکنیت کا منصب پیش کیا گیا۔ وہ پرنس آف ویلز اور ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں بھی مدعو کئے گئے۔ لیکن اعزازات کی یہ طویل تفصیل سرسید کے حقیقی مقصد سے غیر متعلق تھی اور وہ مقصد تھا اپنے دور کی عظیم ترین سلطنت اور ممتاز ترین قوم کی تعلیم و تربیت کے مرکزوں سے اپنی قوم کی باز آفرینی اور سربلندی کی راہ تلاش کرنا۔ اور سرسید اس مقصدِ عزیز سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوئے۔ انھوں نے وہاں کی ایک ایک علمی حرکت کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور ایک ایک ارتقائی تحریک کی گہرائیوں کو جانچا۔

نواب محسن الملک آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کے نام اپنے ایک مکتوب میں سرسید کی انہی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> سرسید احمد خاں ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انہی کے گھروں اور انہی کے ملک میں دیکھیں۔ اور جو کچھ وہاں دیکھا ہو اُسے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت جاکر تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارتوں کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامیٔ دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا "خطباتِ احمدیہ" کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص

کا انگلستان جانا قوم کے لئے تھا۔ رہنا قوم کے لئے اور پھر واپس آنا قوم کے واسطے۔" (حیاتِ جاوید)

قیام انگلستان کے دوران میں اس محسن قوم نے جو تاثرات انگلستان میں چھوڑے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی واپسی پر انگلستان کے اخبار ہوم ورڈ میل میں ایک ہندوستانی مسلمان (مقیم لندن) سید عبداللہ کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا تھا اور اس طویل مضمون سے مقتبس یہ چند الفاظ قابلِ غور ہیں۔

> جن انگریزوں سے یہاں (انگلستان میں) ان کی ملاقات ہوئی ان پر ان کی عام لیاقت کا بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبرینِ سلطنت کی رائے یہ ہے کہ اگر ہم ایسے قابل اور ہمہ دان ہندوستانی مسلمان سے جیسا کہ سید احمد خان ہیں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی قابلیت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی (POOR) ہوتی۔

دارالعلوم علی گڑھ کا قیام

۲ر اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء کو سرسید انگلستان سے واپس پہنچے۔ انھیں پہلے سے اس حقیقت کا اندازہ ہو چکا تھا کہ ملک کا مروجہ نظامِ تعلیم اُس مشن کی تکمیل نہیں کر سکتا جو قومی ترقی کے لئے ان کے پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ جب وہ واپس آئے تو اپنے ذہن میں ایک الگ یونیورسٹی کا منصوبہ لے کر آئے۔ وہ قیامِ انگلستان کے دوران میں وہاں سے بہت سے مضامین ملکی اخبارات میں شائع کرا چکے تھے اور ان کا جو ردِّ عمل ہوا اس سے انھیں بخوبی اندازہ تھا کہ ان کی تعلیمی تحریک کو لازماً قوم کے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑے گا اور خواہ کچھ بھی ہو وہ تمام رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے بہت بڑا اور صبر آزما کام تھا۔ قوم کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کو بدلنا، افرادِ ملت کو وقت کے تقاضوں سے باخبر کرنا اور انھیں اس حقیقت کا احساس دلانا کہ اگر وہ ان تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے تو زمانہ ان کا نام ونشان تک مٹا کر رکھ دے گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مشہور مجلہ "تہذیب الاخلاق" کا اجرا ہوا۔ یہ موقع تہذیب الاخلاق کے صحافتی اور علمی کارناموں کے ذکر کا نہیں۔ 'تہذیب الاخلاق' کی مخالفت بھی ہوئی۔ اس کے خلاف کئی ایک اخباروں کا اجرا بھی ہوا۔ تکفیر کے زہریلے تیر بھی چلے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے۔ قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ تہذیب الاخلاق کی پکار قوم کے باشعور اور دور اندیش طبقہ کو خوابِ غفلت سے جگانے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئی۔ اور ۲۴ر مئی سنہ ۱۸۷۵ء میں سرسید کے خوابوں کی اوّلین تعبیر مدرسۃ علی گڑھ کے قیام کی صورت میں منظرِ عام پر آ گئی۔ جولائی ۱۸۷۶ء میں سرسید ملازمت سے مستعفی ہو کر علی گڑھ چلے آئے اور اپنی زندگی کو پوری طرح اس محبوب مقصد کے لئے وقف کر دیا جس سے ملت کی نشاۃ ثانیہ اور مستقبل کی کامرانیاں وابستہ تھیں۔ اب ان کی شب و روز کی مسلسل مساعی سے کام کی رفتار تیز ہو گئی چنانچہ ۸ر جنوری سنہ ۱۸۷۷ء کو وہ مبارک دن بھی آ گیا جبکہ لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے علی گڑھ پہنچ کر کالج کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہ دارالعلوم قومی یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ارتقائی مراحل طے کرنے لگا۔ سرسید یقین رکھتے تھے کہ موجودہ یونیورسٹیاں مسلمانوں کی قومی ضروریات کے مناسب ان کی تعلیمی و تربیتی کا امکان پورا نہیں کر سکیں گی اس لئے ان کا مطمحِ نظر ایک مسلم یونیورسٹی

کا قیام تھا جہاں نئی نسل کی شایانِ شان تربیت اور تعمیر و ترقی کے پورے وسائل موجود ہوں۔

سرمایہ کی فراہمی

اب دارالعلوم علی گڈھ محض ایک تعلیمی مرکز ہی نہیں تھا بلکہ ایک ایسی قوم کی حیاتِ نو اور بازآفرینیوں کا سرچشمہ تھا جو سالہا سال سے بستر مرگ پر دم توڑ رہی تھی اور جسے "ہنگامۂ بغاوتِ ہند" کے پے در پے زخموں نے ملیامیٹ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس دارالعلوم کو قوم کی جیتی جاگتی امنگوں کا محور اور اس کے خوش آئند مستقبل کا شہ نشان (LAND MARK) بنانے کے لئے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔ سرسید نے اس مقصد کے لئے پہلے ایک کمیٹی (خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین) کی تشکیل کی اور پھر وہ ملک کے طوفانی دورے پر بنفس نفیس نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی پُرجوش اور حیات انگیز تقریروں سے امرائے قوم کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑا اور بالآخر ایک دن اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی امید سے کہیں بڑھ کر قوم نے ان کا دامن سرمائے سے بھر دیا۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے جو ملک گیر بڑے بڑے سفر کئے ان میں ان کے ساتھ دیگر رفقاء بھی ہوتے تھے۔ سرسید کو یہ تمام اخراجات اپنی ذاتی گرہ سے برداشت کرنے پڑتے تھے اور انھیں اس مقصد کے لئے بہت بھاری قرضے بھی اٹھانے پڑتے تھے لیکن وہ کبھی اس بات کے لئے تیار نہ ہوئے کہ یہ اخراجات کالج کمیٹی کے حسابات سے وصول کریں۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان کی گرہ ساتھ نہ دیتی اور سفر ضروری ہوتا۔ ان کے احباب انھیں مشورہ دیتے کہ جب سارا کام کالج کے لئے ہو رہا ہے تو یہ ضرورت کالج فنڈز سے پوری کر لیجئے لیکن اصول کا دھنی سرسید صاف کہتا کہ "مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ دارالعلوم چلے یا نہ چلے مگر میں اس کے لئے سفر اسی حالت میں کر سکتا ہوں جبکہ سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں"۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہر جگہ جہاں وہ چندہ کے لئے جاتے یہ لکھدیا ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کی دعوت قبول نہیں کریں گے اور جو کچھ ان کی مہمانداری اور دعوتوں پر خرچ کرنا مقصود ہو وہ دارالعلوم کے لئے نقد دے دیا جائے۔ انھوں نے سید محمود کی دعوتِ ولیمہ اور پوتے کی بسم اللہ کی تقریب پر کچھ خرچ کرنے کی بجائے نقد رقوم کالج کمیٹی میں بطور چندہ جمع کرا دیں۔ حالانکہ اس سے ان کے کئی رشتہ دار ان سے بگڑ بیٹھے۔

اپنے دارالعلوم کو قومی تعمیر کی تاریخ میں بے مثال مقام دلانے کے لئے سرسید پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ انھوں نے شادی و غمی کی رسموں پر روپیہ صرف کرنا۔ انفرادی طور پر غربا و مساکین کی امداد کرنا یا رفاہِ عام کے امور میں کچھ خرچ کرنا الغرض اس قسم کے تمام ابواب بند کر دیئے تھے اور جو کچھ ہوتا دارالعلوم کو دیئے چلے جاتے تھے۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ ان کے دوست، ان کے عزیز، ان کے رشتہ دار وہی ہیں جو اس اہم مقصد میں ان کی امداد کریں۔ انھوں نے ان رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لیا جو دارالعلوم کی امداد کے لئے تیار نہ ہوئے اور ان سب کو اپنے عزیز اور بھائی بند سمجھا جو اس کارِ خیر میں ان کے شریکِ کار بنے۔ چندے کے حصول میں انھوں نے ہر قسم کے تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ اغنیاء احباب سے بے تکلف مانگتے تھے۔ ان سے لڑتے جھگڑتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ احباب دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے کبھی نہ تھکتے تھے۔ انھوں نے ایک آرٹیکل میں لکھا تھا۔

ہمارا حال تو اب یہ ہو گیا ہے کہ دوست بھی اب ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت

ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا ہے سو اس لکھے
کی بدلتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے۔

انہوں نے ایک اجنبی اور مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا چندہ طلب کیا۔ جان نہ پہچان۔ اس انگریز نے اسے کچھ برا محسوس کیا اور بڑے روکھے پن سے جواب دیا کہ "آپ کو اس کام کے لئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیئے دوسروں سے نہیں"۔ سرسید نہ معلوم اس قسم کے کتنے ہی روکھے پھیکے جواب پہلے سن چکے تھے۔ فوراً جواب دیا۔

بے شک اپنی قوم کی پست ہمتی کے باعث ہم غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنے کے لئے مجبور ہیں۔ مگر یاد رکھیئے کہ اگر انگریزوں کی امداد کے بغیر یہ انسٹی ٹیوشن کامیاب ہو گیا تو انگریزوں کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت کی بات اور نہ ہو گی کہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھانے کے باوجود وہ ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔

وہی انگریز سرسید کے اس جواب سے اب ندامت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف بڑھا اور بیس روپے کے نوٹ نکال کر سرسید کی نذر کئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ سید محمود سے انگلستان میں پیش آیا۔ وہ اپنے دوستوں سے ملنے کیمبرج گئے تو معلوم ہوا کہ اس یونیورسٹی کا سرمایہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ یونیورسٹی کے چرچ کی خوبصورت عمارت گرا کر دس لاکھ روپیہ اس کی از سر نو تعمیر پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ یہ سن کر انہوں نے وہاں کے ایک دوست سے بے ساختہ کہا کہ "اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اتنا روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اتنا بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ علی گڑھ کے لئے ہی دے دیا ہوتا۔" ان کے دوست نے پوچھا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان بستے ہیں؟ اور جب سید محمود نے جواباً بتایا کہ "چھ کروڑ!" تو اس انگریز نے جو کچھ کہا وہ ایک تازیانۂ عبرت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے کہا تھا۔

جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہوں کہ چھ کروڑ مل کر اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے۔ ان کی امداد کرنا گناہ ہے۔ ان کو تباہ ہونے دو۔

ایک زندہ اور جہانگیر قوم کا فرد کیا سمجھتا کہ مردہ قوموں کی بے حسی کی کیفیت کیا ہوتی ہے اور انہیں بانگِ صورِ اسرافیل بھی کس طرح جگانے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ لیکن سرسید نہ تو اس قوم کی موت کا تماشا دیکھنے آیا تھا اور نہ اس کی قبر پر آنسو بہانے اور پھول چڑھانے۔ وہ اسے تباہ ہوتے کیونکر دیکھتا۔ وہ مخالفتوں کے طوفان میں بھی اپنی دھن میں لگا رہا۔ اس کی چندہ کی فراہمی کا سلسلہ مایوسیوں پر بھی جاری رہا۔ اور اس کی ہمت اور جذبۂ صادقہ نے ایک دن وہاں لاکھوں روپوں کی وہ پرشکوہ عمارتیں کھڑی کر دیں جنہیں دیکھ کر ایک ایرانی سیاح وجد میں آ گیا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

واللہ! معجزہ می نماید۔ کارے کہ از سلطنت بر نیاید۔ چگونہ از یک فرد رعیت انجام شد

پرشکوہ عمارتوں کی تعمیر

ابتدائی ایام میں جبکہ آمدنی کے ذرائع اور وسائل بڑے محدود اور ناکافی تھے، اور

دوسری جانب تعلیمی اخراجات کا سلسلہ بڑا وسیع تھا سرسید کے رفقاء یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ دارالعلوم کی عمارتوں پر زیادہ رقم خرچ ہو لیکن سرسید کے ذہن میں جو منصوبے پرورش پا رہے تھے وہ اس سے مختلف اور بظاہر عجیب و غریب سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک کالج کی عمارتوں پر بے دریغ رقوم خرچ نہیں کی جائیں گی اور اعلیٰ درجہ کی معیاری اور دیدہ زیب عمارات قائم نہیں ہوں گی تو می تعلیمات کے اس مرکز اور پیش نہاد کی عظمت دلوں پر نقش نہیں ہو سکیگی جو دارالعلوم علی گڈھ کے محسوس و مشہود پیکروں میں پروان چڑھ رہا تھا چنانچہ انھوں نے ساری توجہ عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر پر مبذول کئے رکھی اور اس کام کے لئے بڑی بھاری رقمیں قرض لیں۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ سرسید کا یہ خیال حرفاً حرفاً درست ثابت ہوا۔ یہ دارالعلوم کی عمارتوں کا شان و شکوہ اور دلکشی تھی جس نے پوری قوم کو متاثر کیا۔ انتہائی مخالفتوں کے باوجود جو ملک کے طول و عرض میں برپا تھیں۔ علی گڈھ کی یہ پرشکوہ عمارتیں قوم کی آرزوؤں، امنگوں اور دلچسپیوں کا محور بن گئیں اور جب بھی سرسید نے اپنا دامن دراز کیا اس کی ملت نے اسے زر و جواہر سے بھر دیا۔ انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کینن بارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ جیسے عظیم ممالک کی سیاحت سے واپس ہوئے تو انھوں نے بانگ دہل یہ کہا کہ انھوں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں کا ہم پایہ علی گڈھ کالج کے سوا اور کوئی کالج کہیں نہیں دیکھا۔ تعلیمی کمیشن کے صدر مسٹر وارڈ نے کمیشن کا اجلاس علی گڈھ میں طلب کیا تو وہاں ایک ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے۔

> جس وقت میں نے کمروں کی ان قطاروں کو دیکھا جو مکمل ہونے کے بعد دنیا میں اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارتیں ہوں گی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر نئی ہمت پیدا نہ ہو۔

ملک کے ایک معزز اور ممتاز مسلمان نے دارالعلوم علی گڈھ کی ان بلند و بالا اور حسین و جمیل عمارتوں کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کئے۔

> جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں مسلمان یہ دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی وہ کام کر جاتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔

عزت و شہرت سے بے نیازی

ایک طرف قومی تعلیم و تربیت اور تعمیر و ترقی کے یہ لازوال کارنامے سرانجام پا رہے تھے اور دوسری طرف اس گرانمایہ تعمیر کا بانی ہر قسم کی عزت و شہرت اور نمود و نمائش سے کلیتہً بے نیاز اپنا خون پسینہ ایک کئے چلا جا رہا تھا۔ بار بار یہ تحریک ہوئی کہ اگر اس کے نام کی کوئی یادگار نہیں تو کم از کم ایک کتبہ ہی کہیں نصب کر دیا جائے لیکن وہ کبھی اس کے لئے رضامند نہ ہوئے اور ہمیشہ مخالفت کی۔ کالج کے طلباء اور اساتذہ نے بارہا یہ خواہش کی کہ ان کی سالگرہ کا دن (FOUNDER'S DAY) کی حیثیت سے یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح ایک قومی تقریب کے طور پر منایا جائے لیکن انھوں نے یہ خواہش بھی رد کر دی اور یہ تحریک کی کہ فاؤنڈرز ڈے (FOUNDER'S DAY) کے بجائے فاؤنڈیشن ڈے (FOUNDATION DAY) یعنی کالج کی سالگرہ کا دن (یوم تاسیس) منایا جایا کرے۔

تعلیمی انقلاب

سرسید کے ان کارناموں کی تفصیل اور دارالعلوم علی گڈھ کے قیام کے تذکرہ کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس وقت اس عظیم قومی درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا اس وقت علمی میدان میں ہمارے زوال و پستی کی کیفیت کیا تھی اور علی گڈھ کے سرچشمہ نور نے مایوسی کی ان تاریکیوں کو کن تابناکیوں میں بدلا اور ملت کے در و دیوار کس طرح دیکھتے دیکھتے علوم جدیدہ کی جلوہ باریوں سے جگمگا اٹھے۔

اس مقام پر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سنہ ۱۸۵۸ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت سے لے کر سنہ ۱۸۷۸ء تک (بیس سال کے عرصے میں) جبکہ دارالعلوم علی گڈھ کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا تمام ملک میں مسلمان گریجوایٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جس میں سترہ بی اے اور صرف تین ایم اے تھے۔ اس کے مقابلے میں ہندو گریجوایٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہونچ گئی تھی جن میں ۷۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے۔ علی گڈھ کالج کے نتائج سنہ ۱۸۸۰ء میں نکلنے شروع ہوئے اور سنہ ۱۸۹۰ء میں جبکہ ابھی اٹھارہ برس گذرے تھے مسلمان طلباء میں سے ۱۲۶ گریجوایٹ کامیاب ہو چکے تھے اور ۱۷۴ انڈر گریجویٹ تھے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں قانون کی کلاس کا آغاز ہوا۔ اور آٹھ برس میں ۱۴۔ ایل ایل بی اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔

یہی نہیں بلکہ علی گڈھ کی اس روشنی سے کئی نئے چراغ بھی روشن ہو گئے۔ یعنی لاہور۔ امرتسر۔ کراچی میں اسلامیہ کالجز اور بہاولپور، حیدرآباد میں اسٹیٹ کالجز کا اجرا ہوا۔ چاروں طرف حصولِ تعلیم کے تازہ تازہ ولولے ابھرنے لگے اور سنہ ۱۸۹۳ء تک صرف بارہ سال کی مدت میں مسلمان گریجوایٹس کی (ملک بھر میں) کل تعداد ۳۳۹ سے پہنچ گئی۔ سنہ ۱۸۹۴ء سے سنہ ۱۸۹۶ء تک پنجاب اور الہ آباد کی صرف دو یونیورسٹیوں سے ۱۸۵ مسلمان بی اے اور ایم اے کے امتحانوں سے کامیاب ہو کر باہر آئے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اب علی گڈھ سے جدید علوم کی روشنی ابھر ابھر کر چاروں طرف پھیل رہی تھی اور وہ ملت جو چند سال قبل گرد راہ کی طرح پامال سمجھی جا رہی تھی اس کے نوجوان قلوب و اذہان میں علم و فکر کی نئی روشنی لئے ہنگامہ کارزار میں قومی نشو و ارتقاء کی شاہراہیں پیدا کر رہے تھے۔ سرکاری دفاتر میں داخل ہو رہے تھے۔ عدالتوں میں وکالت کی ذمہ داریاں سنبھال رہے تھے۔ سیاسیات کے آسمانوں پر سرگرم پرواز ہونے کے لئے پر تول رہے تھے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کی سی غیر ملکی یونیورسٹیوں کا رخ کر رہے تھے۔ ان کے بڑھتے ہوئے قدموں اور ذوقِ سفر کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لئے ایک شایانِ شان ادارے کی ضرورت تھی۔ سرسید کی عقابی نگاہیں اس مقصد کی اہمیت کو بجا طور پر محسوس کر چکی تھیں۔ چنانچہ دارالعلوم کے قیام کے چند ہی سال بعد (سنہ ۱۸۸۶ء میں) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جیسا عظیم الشان قومی ادارہ متشکل ہوا۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور سرپرستی کے سلسلہ میں جو معرکہ آرا خدمات انجام دیں وہ تاریخ کے ایک الگ باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بہرحال اجمالاً یہ بتانا ضروری ہے کہ اس تنظیم نے ملک کے طول و عرض میں قوم کے اندر علمی ذوق و شوق کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے قرآن کریم کی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے جدوجہد کی۔ سرکاری مدارس میں مسلم طلباء کو مذہبی تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنے پر زور دیا۔ ملک کے طول و عرض میں اپنی ماتحت

کمیٹیاں قائم کیں۔ مسلمان طلباء کی وظائف سے امداد کی۔ مغربی مؤرخین کی الزام بازیوں کے جواب میں ایسا لٹریچر شائع کیا جو اسلام کے عالم آرا مقاصد اور کارناموں کو نکھار کر نگاہوں کے سامنے آئے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کانفرنس نے پورے ملک کے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کی بھی سرپرستی کی۔ ہندو، مسلمانوں سے چالیس سال آگے جا چکے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے نام پر وہ اپنے آپ کو سیاسی لحاظ سے کافی مستحکم بنا چکے تھے۔ دفتری نظام میں بھی انہیں کافی عمل دخل حاصل تھا اور اپنے ان ملک گیر اثرات اور قومی سنگھٹن کے زور پر وہ کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ مسلمان ان کے مد مقابل بننے کے قابل ہو سکیں۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں اسی کانفرنس نے برادرانِ وطن کی رکاوٹوں کا مقابلہ کیا۔ اور مسلمانوں کو کشاں کشاں تعمیر و ترقی کی منزل مقصود کی جانب بڑھائے چلی گئی۔

تہذیب الاخلاق کا پیغام بیداری

دارالعلوم علی گڑھ اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ساتھ قوم کی بیداری میں تہذیب الاخلاق کی خدمات بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اس جریدہ کے اجراء کا منصوبہ سرسید انگلستان سے لے کر آئے تھے۔ انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ انگلستان سے واپسی کے بعد انہوں نے ملک میں جس تعلیمی مہم کا آغاز کرنا تھا اس کی آواز ملک کے گوشے گوشے تک پہنچانے کے لئے ایک ایسے آرگن کی ضرورت ناگزیر ہوگی جو قوم کو حالات کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے اور نئی منزل پر آغاز سفر کے لئے ذوق سفر کے ولولوں کو ابھار سکے۔ چنانچہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اور اس نے پانچ برس کے اندر اندر وہ زمین تیار کر لی جہاں سرسید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ علی گڑھ کے نام سے اپنی تعلیمی امنگوں اور عزائم کی تخم ریزی شروع کر دی۔ اسی جریدہ کی سعی تبلیغ سے یہ بیج برگ و بار لائے اور اسی کی آبیاری سے یہ کشتِ نوبہار پروان چڑھی۔

مذہبی طبقہ میں انقلاب

"تہذیب الاخلاق" کے خلاف مذہب پرست حلقوں نے مختلف شہروں سے بے شمار پرچوں کا اجراء کیا۔ ان میں کانپور کا شہر مخالفت میں سب سے آگے تھا۔ اسی شہر سے سرسید کے خلاف کفر کے فتووں کی بھرمار ہوئی۔ اور یہیں سے "نور الانوار" "نور الآفاق" اور "امداد الآفاق" جیسے اخبار جاری ہوئے۔ جن کا وظیفۂ حیات ہر معاملہ میں سرسید اور تہذیب الاخلاق کی مخالفت اور شب و روز کفر کے نئے نئے فتوے شائع کرنا تھا۔ لیکن وقت اور حالات کے تقاضے نہ تو رد کئے گئے ہیں اور نہ دبائے دبتے ہیں۔ اسے ایک معجزہ سمجھئے کہ مخالفت کے اسی مرکز سے علماء کی ایک جماعت اٹھی اور "تہذیب الاخلاق" کی آواز سے متاثر ہو کر اس نے فیصلہ کیا کہ بوسیدہ طرز تعلیم میں حالات کے مطابق تبدیلی پیدا کی جائے۔ پرانے نصاب تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور ایسا نصاب تعلیم اختیار کیا جائے جو ملت کی موجودہ ضروریات کو پورا کر سکے۔ چنانچہ کانپور سے ندوۃ العلماء کے قیام کی تحریک اسی نقطہ نظر کی مظہر تھی۔ قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے ان علماء کے خلاف کافی بدگمانیاں پھیلائی گئیں۔ انہیں سرسید کے ایجنٹ کہا گیا لیکن ان کی کوششوں سے ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آ کر رہا جس کی یوں کہئے گویا قدیم و جدید کے درمیان برزخی حیثیت تھی۔

حدیث دیگراں

علی گڑھ نے ہماری نشاۃ ثانیہ کے لئے جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں وہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی صورت

میں قوم کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ قوم کا ہر ہوشمند اور تعلیم یافتہ فرد ان کارناموں سے باخبر ہے۔ ہم ان کی مزید تفصیل کے بجائے اس خراجِ تحسین کی طرف آتے ہیں جو برطانوی سلطنت کے ممتاز مدبرین نے پیش کیا

خوشتر آں باید کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید با حدیثِ دیگراں

سب سے پہلے ہم اس تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کا بیان سامنے لاتے ہیں جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ملک کے تعلیمی کوائف کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن میں برطانیہ کے ممتاز ماہرینِ تعلیم شامل تھے۔ اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں دارالعلوم علی گڈھ کے ضمن میں یہ لکھا تھا۔

> بعض اعتبارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب انسٹی ٹیوشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹی ٹیوشن ہے اور تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا مستحق ہے۔ حکومتِ برطانیہ کے آغاز سے لے کر اب تک یہ مسلمانوں کی ذاتی کوششوں کا پہلا مظہر ہے۔ علی گڈھ کے انہوں نے جو مثال قائم کی ہے اگر اچھی طرح اس کی پیروی کی جائے تو یہ قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دے گی جن اصحاب نے ایسی دلسوزی سے یہ محنت کی ہے اور جو بدرقہ تعلیم و ترقی کے میدان میں حکومت کو ملا ہے اس کی جس قدر قدر و منزلت کی جائے نامناسب نہ ہوگی۔ (حیاتِ جاوید)

سر جان اسٹریچی (گورنر یو پی) نے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے سنہ ۱۸۸۰ء میں (جبکہ یہ کام ابھی ابتدائی منزل میں تھا) اپنے الوداعی ایڈریس میں کہا تھا۔

> سب سے بڑا اور آخری کام جس میں انھوں نے (سرسید احمد خاں) اپنی زندگی اور وسائل کو وقف کیا، اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور ان کی ترقی...... یہ وہ کام ہے جس کے بعض نتائج کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مجھے قطعاً شبہ نہیں کہ یہ نتائج آئندہ زمانہ میں اور بھی عجیب و غریب صورت اختیار کریں گے۔ لیکن میں آج بھی اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی ترقی کے لئے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات تصور کرتا ہوں (حیاتِ جاوید)

ڈاکٹر ہنٹر (جن کی کتاب "انڈین مسلمانز" کی بنا پر سرسید کے ان سے کامیاب ٹکراؤ کا ذکر اس سے قبل زیرِ بیان آچکا ہے) جب ایجوکیشن کمیشن کے صدر کی حیثیت سے علی گڈھ میں اپنا اجلاس کیا تو وہاں ایک تقریر کے دوران میں انھوں نے کہا

> یہ ایک انتہائی شریف کام ہے جو ایک فانی انسان کے ہاتھوں پردۂ دنیا پر ظہور پذیر ہوا۔ اور یہ موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے بیس برس کی صبر آزما اور پر استقلال کوششوں سے اس کام کو سرانجام دیا۔ پہلے دس برسوں میں میرے اس دوست (سرسید) کو اکثر مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا...... اور لوگوں کی مخالفت اور دشمنی، دوستوں کی سرد مہری، اور جاہل دشمنوں کی پُرضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی۔ مگر اس نے ایک لمحہ کے لئے ہمت نہ ہاری۔ اس کے استقلال سے اس کے مقصد نے ترقی پائی

اور لوگوں نے اس پر اعتماد کیا۔ اس لئے وہ اپنے مقصد پر اعتماد رکھتا تھا۔

برطانوی پارلیمنٹ کے رکن مسٹر کٹین جو ایک فلاحی پروگرام کے سلسلہ میں تبلیغی مشن پر نکلے تھے اپنی کتاب (PICTURESQUE. INDIA) میں لکھتے ہیں۔

> گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اول یہ کہ اس میں مسلمان طلباء کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سنکر یہ طالب علم اسی وسیع احاطہ کی تمام اطراف سے مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ نماز کے علاوہ قرآن، دینیات اور اخلاقیات کی کتابیں ان کے نصاب تعلیم کا حصہ ہیں۔ اور اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں گے وہ قدیم تصورات پر جدید علوم کا پیوند لگائیں گے اور ماضی کی طرف دیکھنے والوں کو حال کے تقاضوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کرینگے۔

پھر وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> قوم کی امیدیں اس انسٹی ٹیوشن سے وابستہ ہیں۔ یہ ایک عظیم کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے میدان میں ایک ایسی قوم سے بروئے کار آئی ہے جس میں تقدیر پر بھروسہ کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست کر دیئے ہیں۔

سر انتھونی میکڈانلڈ نے دارالعلوم کے درخشندہ اور تابناک مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

> یہ امید کرنا قطعاً مبالغہ آرائی نہیں کہ یہ کالج ترقی پاکر مستقبل میں مسلمانوں کی بہت بڑی انسٹی ٹیوشن بن جائیگا اور دنیائے مشرق کا قرطبہ ثابت ہوگا۔ (حیاتِ جاوید)

دارالعلوم کی امتیازی خصوصیات

جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں جدید تعلیم کی اس تحریک سے جس کا آغاز سرسید نے خلوص و ایثار کے بے مثال ولولوں سے کیا ان کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا کہ اپنی آئندہ نسلوں کو مغربی تصورات اور تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو انھیں ایک جداگانہ قومی دارالعلوم اور قومی یونیورسٹی کے لئے اس قدر جان لڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ملک میں ایسی بے شمار درسگاہیں، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں موجود تھیں جو حکومت کے زیر اہتمام چل رہی تھیں۔ انھوں نے تعلیمی کمیشن کے روبرو جو فاضلانہ شہادت دی اور پھر مروجہ تعلیم اور یونیورسٹیوں کے خلاف مسلسل جو زوردار آرٹیکل لکھے وہ صاف اور واشگاف الفاظ میں سرسید کے مشن کی وضاحت کر رہے ہیں اسی مشن کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے دارالعلوم کے طلباء سے ایک خطاب میں کہا تھا۔

> یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ ہے۔ پھر تم اگر آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں باتوں کے نمونے ہوگے اور جبھی ہماری قوم

کو حقیقی عزت نصیب ہوگی۔

چنانچہ دارالعلوم میں تعلیم و تربیت کے خاص ضابطے مقرر کئے گئے۔ ان کے باہمی ربط و تنظیم کے لئے ایک مخصوص بورڈنگ سسٹم قائم کیا گیا۔ ریاضتِ جسمانی کو بے حد اہمیت دی گئی۔ ترکی لباس کو یونیفارم قرار دے کر سادات کا طرح نواز منظر پیدا کیا گیا۔ پنجوقتہ نماز کے اجتماعات میں سب کی شرکت لازمی قرار دے کر یہ سادات اسلامی رنگ میں رنگ دی گئی۔ اطاعت اور ڈسپلن کی حقیقی اسپرٹ پیدا کرنے کے لئے تمام امور میں نگرانی کے ضابطے طے ہوئے جہاں دورانِ تعلیم میں پروفیسر اس ڈسپلن کے ذمہ دار ہوتے وہاں بورڈنگ ہاؤس میں وہ پراکٹر کے احکام کے پابند ہوتے۔ ڈائننگ ہال میں ایک یورپین پروفیسر ان کا نگراں ہوتا۔ کھیل کے میدان میں وہ کیپٹن کے ماتحت ہوتے اور کلب میں اپنے پریسیڈنٹ کے۔ بیماری کی حالت میں انھیں ڈاکٹر کی فرماں پذیری اختیار کرنی پڑتی اور مسجد میں ایک عالم دین ان کا امیر ہوتا۔

اسی مسلسل اور پیہم اطاعت اور قائم و دائم ڈسپلن نے علی گڈھ کے طلباء میں وہ امتیازی خصوصیتیں پیدا کر دیں جو ملک کے دیگر تعلیمی اداروں میں مفقود تھیں اور یہی وجہ تھی جس کی بنا پر یہاں کے طالب علموں کو قومی زندگی میں ایک مخصوص اور قابلِ قدر مقام حاصل ہو گیا

اسلام سے وابستگی

اسی تربیت نے آسمانِ ملت کے ان درخشندہ ستاروں میں اسلام سے سچی وابستگی پیدا کی۔ دینی تعلیم ان کے نصاب کا لازمی جزو تھی۔ مسجد میں ان کے پنجوقتہ اجتماعات اس وابستگیٔ دین کے دلنواز اور پرکشش مظہر ہوتے تھے۔ اور صاف نظر آتا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کے یہ فرزند زمانہ کے تقاضوں اور نئے حالات کی ضرورتوں کا سچا احساس دلوں میں لے کر زندہ اقوام کے دوش بدوش زندگی کی منزلوں پر قدم بڑھانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہی سرسیدؒ کے سہانے خواب کی حیات افروز اور جیتی جاگتی تعبیر تھی۔

علی گڈھ کی اسی درخشندہ تصویر کا ایک نقشِ تابندہ ہم قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ علی گڈھ کی تاریخ کا یہ ایک عام واقعہ ہے جو پچھلے دنوں "صدق جدید" لکھنؤ کے مخصوص کالم (سچی باتیں) میں مدیر اخبار مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ہم بجنسہٖ اسے نقل کرتے ہیں۔

> غالباً ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے۔ سرسید کی وفات یا تو ہو چکی تھی یا عنقریب ہونے کو تھی۔ علی گڈھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی کہ ایک کرکٹ میچ سول سروس والوں کے مقابلہ میں نینی تال میں قرار پایا۔ میچ شروع ہوا اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا۔ سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی اور علی گڈھ ٹیم کھلا رہی تھی۔ علی گڈھ کے شہرہ آفاق باؤلر اشفاق بولنگ کر رہے تھے۔ بس ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھایا کہ اسی سیکنڈ نماز جمعہ کی اذان کی آواز کانوں میں آئی اور معاً بلا ادنیٰ توقف کے مسلمان باؤلر کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ بولنگ ہی پوری کر لیتا۔ سول سروس والے اس پابندیٔ احکام پر عش عش کر اٹھے۔

یہ واقعہ رقم کرنے کے بعد مولانا دریا بادی بطور تبصرہ لکھتے ہیں۔

"جی ہاں! یہ تھا مسلمان بادشاہ کا کردار۔ "بے دین اور نیچری سر سید" کی درسگاہ کے ایک کھلاڑی کی حمیت اسلامی اور غیرت دینی۔ کرکٹ کے کھیل میں بھی جزئی احکام شریعت کی پابندی۔

یہ تھا سر سید کا علی گڈھ یعنی وابستگی۔ انسانی شرافت، تعلیمی نشوونما، علمی سرفرازی، وسیع النظری، بلند خیالی، حسن تنظیم، ضبط نفس ایثار و اخلاص، وحدت فکر و عمل اور قومی اتحاد و یکجہتی کا حسین امتزاج ـــــ سر سید کے حسین خوابوں کی روح نواز اور دلکش تعبیر۔ قوم کی آرزوں کا مرکز اور عزائم کا محور ـــــ یہی ہے وہ چشمۂ آبحیات جہاں سے قوم کو حیات نو حاصل ہوئی۔ یہ سرچشمۂ نور نہ پھوٹتا تو ظلمتان ہند کے جنگلوں اور بیابانوں میں ہم آج بھی وحشی قبائل کی طرح سرگرداں پھرتے نظر آتے۔ یا اچھوتوں کی طرح ہندوؤں کی غلامی کرتے۔

لیکن یاد رکھیے کہ انسانی تاریخ کا یہ لازوال شاہکار مرتب کرتے ہوئے اس زعیم ملت کو بے مثال قربانیاں کرنی پڑیں۔ مخالفتوں کی بے پناہ یورشوں کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑا۔ ایسے عظیم کارناموں کے لئے بقول اقبالؒ

پلٹنے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسس

"نسادی سبیل اللہ" کو مقصد حیات اور کفر کے فتووں کو خدمت دین قرار دینے والوں کے نصیب میں یہ سرمایۂ افتخار کہاں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مشہور فاضل انگریز سر آکلینڈ کالون نے اس زعیم کی وفات پر کس قدر درست کہا تھا۔

جس شخص کو آج آپ رو رہے ہیں یاد رکھیئے کہ وہ اس قدر مفلس تھا کہ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا اور نہ مرنے کو[1] لیکن وہ آپ کے لئے ایک گرانمایہ خزانہ چھوڑ گیا اور یہ نشان منزل دے گیا کہ تعصب اور جہالت کے مقابلہ میں شریفانہ جنگ جاری رکھو۔

---

[1] سر سید وفات سے کوئی ہفتہ عشرہ قبل سید محمود کی کوٹھی سے حاجی اسمٰعیل خاں کے ہاں اُٹھ آئے تھے اور وہیں وفات پائی۔

تصحیح

طلوع اسلام بابت فروری سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۹، سطر ۷ آخری لفظ "شکسپیر" کے بجائے "کیٹس" ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔

چیونٹی یا انسان؟

بقدرِ طاقتِ خود می کنند استدراک

(محترم عطاء اللہ صاحب پالوی)

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے رسالہ ترجمان القرآن (جلد ۲ شمارہ ۴) میں بسلسلہ تفہیم سورہ نمل، اُن لوگوں کا مضحکہ اڑایا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وادیٔ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی مڈبھیڑ "چیونٹیوں" سے نہیں بلکہ انسانوں سے ہوئی تھی۔ مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ واقعی "چیونٹیاں" تھیں اور جس وادی میں یہ "چیونٹیاں" تھیں وہ شام میں ہے۔ جواباً محترم ابوالجلال صاحب ندوی کا ایک مقالہ رسالہ طلوع اسلام (جلد ۱۲ شمارہ ۱۲) میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ وادیٔ نمل میں "چیونٹیاں" نہیں بلکہ "انسان" بستے تھے اور یہ کہ یہ وادی شام میں نہیں یمن میں، شمالی عرب میں نہیں جنوبی عرب میں ہے۔

ندوی صاحب کا مضمون عالمانہ ہے اور جہاں تک وادیٔ نمل کے شام میں ہونے کے دعویٰ کا تعلق ہے، انھوں نے متعدد تاریخی شہادتیں ایسی پیش کی ہیں جن میں گنجائشِ کلام نہیں کیونکہ ان کے دعوے کی بنیاد "مفروضات" پر نہیں بلکہ حقائق پر ہے۔ البتہ جہاں تک اس وادی میں "چیونٹیوں" یا "انسانوں" کے ہونے یا اس وادی میں حضرت سلیمانؑ کی آمد کی وجہ کا تعلق ہے۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ قرآن کی حد تک محدود ہے اس لئے اس بارے میں مزید کچھ سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

جس حد تک "چیونٹی" یا "انسان" کا تعلق ہے، ندوی صاحب کی یہ دلیل بہت وزنی ہے کہ چیونٹی ایک صامت اور بے آواز کیڑا ہے۔ کسی انسان نے آج تک کسی چیونٹی کی آواز نہیں سنی۔ چڑیوں کی آوازیں ہم سنتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے قصے میں چڑیا کی بات نقل کرنے سے پیشتر خدا نے ان کو "منطق الطیر"[1] کے علم سے نوازنے کا ذکر کیا۔ لیکن نمل کی بات کا ذکر کرنے سے پیشتر "منطق النمل"

---

[1] ہمارے نزدیک یہ بھی چڑیوں کی باتیں نہیں تھیں۔ انسانوں ہی کی تھیں۔ (طلوع اسلام)

کی تعلیم کا ذکر نہیں کیا۔ نمل اور نملہ سے مراد "چیونٹیاں" ہوتیں تو چیونٹی کی بات کے ذکر سے پہلے خدا نے اُن کو چیخ کر بولنے، حضرت سلیمانؑ کو ان کی بولیاں سننے کی اور اُن کی باتیں سمجھنے کی قدرت بخشنے کا ذکر بھی منطق الطیر کی تعلیم کے ذکر کے ساتھ پہلے کر دیا ہوتا۔

اس دلیل کے جواب میں، انسانوں کو حیوان بنا دینے والوں کی طرف سے جو کچھ اب تک کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے یا کہا جا سکیگا وہ یہی ہے کہ یہ چیونٹیاں "پَردار" تھیں۔ یہ اس لئے کہ اس طور پر "چیونٹیوں" کا شمار "طیر" میں ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ "طیر" کے معنی "پَروالا" نہیں بلکہ "دونوں بازوؤں سے اُڑنے والے" کے ہیں اور یہ تعریفِ کسی "لغت نویس" کی کی ہوئی نہیں بلکہ خود "خالقِ طیر" کی کی ہوئی ہے۔

طَآئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (۶/۳۸)

پرندے اپنے دونوں ڈینوں سے اُڑتے ہیں

چیونٹیاں پَردار بھی ہوں تو ان کا شمار "طیر" میں کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ "تتلیاں" اور "مکھیاں" بھی پَر رکھتی ہیں مگر کیا اُن کا شمار "طیر" میں ہوتا یا کیا جاتا ہے؟ نیز اگر یہ وادئ نمل والی چیونٹیاں واقعی "پَردار" ہوتیں تو اس جگہ لفظ "نملہ" نہ آتا بلکہ "وعاعہ" یا "رقہ" آتا۔ مگر اس کے باوجود انہیں "طیر" میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ حضرت سلیمانؑ کے قصے میں حصر ہے کہ پرندے "کی" "بولی" کا علم اُن کو دیا گیا تھا۔ پھر جو پرندہ آواز نہیں نکالتا وہ بھی اس شمار میں نہیں آتا چہ جائیکہ "چیونٹی" جو بے پَر کا بے آواز کیڑا ہے۔ اور اس صورت میں یہ کسی طرح بھی نہیں مانا جا سکتا کہ وادئ نمل میں "چیونٹیاں" تھیں، اور وہ بولتی اور آواز نکالتی تھیں اور اُن کی بولی حضرت سلیمانؑ سمجھتے تھے۔ یہ ساری باتیں خلافِ قرآن ہیں۔

"چیونٹیاں" دنیا کے ہر حصہ میں اور بڑی بڑی تعداد میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ اُن کے لئے کسی خاص مقام کی تخصیص نہیں کہ کوئی خاص وادی صرف چیونٹیوں کے لئے مخصوص ہو اور وہ مقام "وادئ نمل" کہلائے۔ تاریخ و جغرافیۂ عرب میں سیکڑوں وادیوں کا ذکر آیا ہے۔ خود قرآن میں قومِ عاد کی تباہی کے سلسلہ میں اُن کی وادیوں کا ذکر ہوا ہے (۴۶/۲۴)۔ مسلمان مجاہدوں کی جفاکشی کے سلسلہ میں ان کی بہت سی وادیاں قطع کرنے کا ذکر کیا گیا ہے (۹/۱۲۱)۔ یہاں تک کہ نام کے ساتھ بھی چند وادیوں کا قرآن میں ذکر ہے مثلاً وادی غیر ذی زرع (۱۴/۳۷)، یا وادئ ایمن (۲۸/۳۰)، یا وادی مقدس طوی (۲۰/۱۲، ۷۹/۱۶)، یا وادئ ثمود (۸۹/۹)۔ ان تمام وادیوں میں سے کوئی وادی بھی "حیوانوں" کے لئے مخصوص نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خیالی وادی بھی انسانوں (شعراء) ہی کے لئے قرآن میں وقف بتائی گئی ہے (۲۶/۲۲۵)۔ پھر وادئ نمل کو چیونٹیوں کی وادی کیسے سمجھا اور مانا جا سکتا ہے، جبکہ قرآن نے کسی جگہ کسی مخصوص حیوان کی وادی کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی مورخین و محققین نے عرب کی کسی وادی کو صرف کسی خاص قسم کے حیوانوں کے لئے مخصوص پایا اور ظاہر کیا ہے؟ اندریں صورت لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وادئ نمل میں چیونٹیوں کی آواز نہیں بلکہ انسانوں کی آواز گونجتی تھی۔

وادئ نمل کو صرف اس لئے کہ نمل کے معنی "چیونٹی" کے ہیں، چیونٹیوں کی وادی ماننا ممکن نہیں ہے کیونکہ "نمل" قبیلہ کا بھی نام ہو سکتا ہے۔ "مازن" "چیونٹی" کے انڈے کو کہتے ہیں مگر عرب میں ایک مشہور قوم کا بھی نام تھا۔ "منتہی الادب" کی بات مانی جائے

تو نمل خاص نام کے طور پر بھی آتا ہے اور عرب میں قبائل کا نام حیوانوں کے نام پر ہونا یا اس قبیلے کا نام بحذف مضاف لیا جانا عام بات ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب "ارض القرآن" میں:

(۱) قبائل عرب میں ...... حیوانات کے نام بکثرت آتے ہیں۔ جیسے بنو اسد، بنو فہد، بنو تغلب، بنو کلب بنو نمل، بنو عجل وغیرہ۔

(۲) عاد، ثمود، سبا، جرہم وغیرہ کے ناموں سے اکثر شخصی نام سمجھے گئے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اسی بنا پر اگر یہ مذکور ہے کہ پہلی سلطنت سبا نے قائم کی تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کوئی شخص مسمٰی بہ سبا نے قائم کی بلکہ حسب عادت عرب، بحذف مضاف، بنو سبا، سمجھنا چاہیئے۔

(۳) سامی اقوام کا یہ خاص مذاق ہے کہ مقامات سکونت کے نام، باشندوں کے نام پر رکھ دیتے ہیں جس سے نہایت آسانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوام کا کہاں مسکن تھا۔

قوموں اور قبائلیوں کے نام سے مقامات کا نام لینا خود قرآن کا بھی انداز ہے قوم سبا جہاں آباد تھی اس خطہ کو صرف سبا کہا ہے بنو مدیان جہاں رہتے تھے اس علاقہ کو مدین کہا ہے۔ عاد و ثمود جہاں رہتے تھے ان علاقوں کو مساکن عاد اور دیار ثمود کہہ کر یاد کیا ہے تورات کا انداز بھی یہی ہے۔ ادوم کی زمین، مواب کی زمین، عمالیق کی زمین بہت جگہ آیا ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ "عاد" مردوں کے لئے "ادا عادہ" عورتوں کے لئے بھی تورات میں آیا ہے۔ پھر اگر سورہ نمل میں قبیلہ بنو نمل کی سکونتی وادی نمل یا وہاں کی ایک عورت کو صرف نملہ کہا گیا تو اس میں کونسی مشکل ہے جس کے حل کرنے کے لئے انھیں انسان سے جانور بنا دیا جائے؟ حضرت سلیمانؑ کی یہی نفیلت کیا کم ہے کہ وہ بولنے اور آواز نکالنے والے پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے کہ خواہ مخواہ بے آواز کیڑے سے بھی بلوایا اور زبردستی اس کی بولی کو ان سے سمجھوایا بھی جائے؟

وادی نمل اور اس کی آبادی کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جس کا تعلق "تفہیم" سے ہو۔ یعنی جو پہلے نہ سمجھی اور سمجھائی گئی ہو اور انھوں نے اس کو سمجھ لیا اور سمجھا دیا ہو۔ اس میں سب کچھ وہی ہے جو "اساطیر الاولین" میں ہے۔ ان کی نگاہ میں اس کا نام "تفہیم" ہو تو ہو مگر وہ ہے ....تا یا "تقلید"۔ یہاں تک کہ انھوں نے تقلیداً ہی اس وادی کا شام میں ہونا فرما دیا۔ کیونکہ اہل روایت نے ا[illegible] ہے۔ بات یہ ہے کہ فلسطین کا مشرقی و جنوبی گوشہ ارض شام سے ملا ہوا ہے۔ لوگوں نے فرض کر لیا کہ جب حضرت سلیمانؑ مع لاؤ لشکر فلسطین سے چلے ہوں گے تو لامحالہ بری راستے سے چلے ہوں گے۔ لہٰذا شام سے گذرے ہوں گے اور جب ان کو راستے میں وادی نمل ملی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وادی شام میں ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ قافلہ کس راستے سے گذرا تھا مگر مجھے اسی میں شبہ ہے کہ ان کا یہ سفر بری راستے سے تھا کیونکہ نہ تو قرآن سے اس کا پتہ ملتا ہے اور نہ قرائن بھی اس خیال کا ساتھ دیتے ہیں۔ قرآن و قرائن دونوں سے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت سلیمانؑ کا یہ سفر بحری تھا۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اہل عرب کے مقابلے میں بحری برتری حاصل تھی۔ سورۂ انبیاء میں ان کے پاس ایسے "شیاطین" کی موجودگی کا ذکر ہے جو

سمندروں میں غوطہ لگانے والے اور اس کے علاوہ دوسرے دوسرے کام انجام دینے والے تھے (۲۱/۸۲) اسی طرح سورۂ صٓ میں اُن کے لئے ہواؤں کے مطیع ہونے کا ذکر ہے (۳۸/۳۶) اور اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُن کے جہاز، فضا یا پانی میں، ہواؤں کے ذریعہ اُن کی خواہش کے مطابق چلتے ہوں۔ فضائی جہاز کے مقابلے بحری جہاز ہونے کا زیادہ قرینہ اس لئے ہے کہ تورات کی کتاب سلاطینِ اول کے نویں باب میں اس کا ذکر موجود ہے۔

> پھر سلیمان بادشاہ نے عصیون جابر میں جو ادوم کے ملک میں بحرِ قلزم کے کنارے ایلوت کے پاس ہے، جہازوں کا بیڑا بنایا اور حیرام نے اپنے ملازم سلیمان کے ملازموں کے ساتھ اُس بیڑے میں بھیجے۔ وہ ملاح تھے جو سمندر سے واقف تھے اور وہ اوفیر کو گئے اور وہاں سے چار سو بیس قنطار سونا لے کر اُسے سلیمان بادشاہ کے پاس لائے۔ (آیات ۲۶ تا ۲۸)

اس سے حضرت سلیمانؑ کے بحری کارخانے، بحری بیڑے اور بحری تجارت کا ثبوت ملتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے "ارض القرآن" جلد اول میں اثری اکتشافات کی بنا پر چند ایک مقامات کی تحقیق یوں پیش کی ہے:۔

> (۱) خلیج عقبہ کے پاس "عیلات" ایک بندر حکومت ادوم سے متعلق تھا۔ حضرت داؤد و سلیمانؑ نے اس حکومت کو اسرائیل میں داخل کر کے اپنے بحری کارخانہ کا صدر مقام قرار دیا تھا۔ جنوبی عرب میں جہاں عدن واقع ہے اوفر نام ایک دوسرا بندر تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے جہاز عیلات سے چل کر یہیں اوفر آتے تھے۔" (صفحہ ۶۵)
>
> (۲) بنو اوفر یمن کے سواحل پر جاگزیں ہوئے، انہی کے نام سے اس مقام کو اوفر کہتے تھے۔ یہ یمن کا قدیم بندرگاہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے جہاز یہاں آکر لنگر انداز ہوتے تھے۔" (صفحہ ۲۲۶)
>
> (۳) حضرت سلیمانؑ کا عہد عبرانیوں کے اوجِ شباب کا زمانہ ہے۔ دنیا میں ان کے جہاز سواحلِ عرب کے چاروں طرف بحرِ احمر سے بندر اوفر تک سفر کیا کرتے تھے جو یمن میں اس وقت تجارت کی منڈی تھی۔" (صفحہ ۶۲)

پھر جب حضرت سلیمانؑ کا بحرِ احمر کے شمالی و مغربی سرے پر خلیج عقبہ کے پاس عیلات نام کا بندرگاہ موجود تھا اور وہیں اُن کا بحری کارخانہ قائم تھا اور جب دوسرے جنوبی و مشرقی سرے پر یمن کا قدیم بندرگاہ اوفر اُن کے قبضہ میں تھا اور جب بحرِ احمر میں اُن کے جہاز بغرضِ تجارت رواں دواں تھے اور جب انھیں عرب کے جنوبی حصے کے خطۂ یمن میں فوجی مہم پر جانا تھا تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ بحری سفر اختیار نہ کرتے۔ لہٰذا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ فلسطین سے اپنی فوج لے کر چلے اور خلیج عقبہ سے بحرِ احمر میں داخل ہوئے اور اوفر پہنچ کر جہازوں سے اُتر گئے اور یمن میں داخل ہوئے اور پہلی مڈبھیڑ وادیٔ نمل والوں سے ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ اُس وقت وہ بری شاہراہ بھی موجود تھی جو بحرِ احمر کے کنارے کنارے مدین و حجاز ہوتی ہوئی یمن کو جاتی تھی جس کا تمام مؤرخین اور جغرافیہ دانوں نے ذکر کیا ہے۔ خود قرآن میں بھی اُس کا ذکر موجود ہے۔ اہلِ سبا کے سلسلہ میں ہے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ (۳۴/۱۸)

اور ہم نے اُن کے (یعنی یمن (سبا) یا جنوبی عرب والوں کے) اور بابرکت آبادیوں (یعنی شام و فلسطین یا شمالی عرب) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر رکھی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں مقرر کر دی تھیں کہ اُن میں دن رات بے خوف و خطر آؤ جاؤ۔

نہ صرف اتنا بلکہ قرآن نے خود اِس راستے کو آباد سڑک اور شاہراہ کا لقب دیا ہے۔

وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ (۱۵/۷۶) "اور یہ بستی (اب تک) آباد سڑک پر موجود ہے"

وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ (۱۵/۷۹) "اور یہ دونوں بستیاں شاہراہ پر واقع ہیں"

مگر حضرت سلیمانؑ چند وجوہ سے برّی سفر اختیار کر کے اس شاہراہ سے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ پیغمبر بھی تھے اور حضرت سلیمانؑ تنہا نہیں بلکہ ایک کثیر فوج کے ساتھ جا رہے تھے۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ (۲۷/۱۷)

اور سلیمان کے لئے، اس کا لشکر اکٹھا کیا گیا تھا جنوں کا، انسانوں کا اور پرندوں کا۔

ظاہر ہے کہ یہ اس قدر عظیم و تیار لشکر تھا جس کو بہ دقت ہی قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے جب فرمایا کہ

فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۷/۱۷) "انھیں قابو میں رکھا جاتا تھا"

حضرت سلیمانؑ اگر خشکی کا راستہ اختیار کرتے اور یہ عظیم لشکر اس شاہراہ کے ذریعہ فلسطین سے یمن تک لے جایا جاتا تو یہاں سے وہاں تک کی آبادیوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ ہو سکتا تھا کہ اس کثیر فوج کے ہاتھوں ان آبادیوں کو نقصان پہنچ جاتا۔ دوسرے جس وجہ سے حضرت سلیمانؑ نے یہ فوج مہم اختیار کی تھی فوجی اور سیاسی نقطہ نظر سے اُس کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ بحری راستہ اختیار کرتے جس کے لئے اُن کو ساری سہولتیں حاصل تھیں۔ سمندری راستے سے جا کر وہ یکایک ان لوگوں کے سروں پر پہنچ جاتے تھے جن کی سرکوبی مقصود تھی۔ چنانچہ (اندازہ ہے کہ) انھوں نے یہی کیا۔ وہ عیلات میں جہازوں پر سوار ہوئے اور بحرِ احمر کو عبور کر کے اَدفر میں اترے اور پھر یمن میں داخل ہو گئے جو اُن کی منزلِ مقصود تھی۔ یوں انھیں راستہ میں پہلی آبادی وادی نمل ملی۔ قرآن نے حتّیٰ کہہ کر وادی نمل کا ذکر شروع کیا ہے۔ (۲۷/۱۸) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر کافی طویل تھا اور وادی نمل فلسطین سے بہت دور واقع تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ طوالت اسی صورت میں ممکن تھی جب وادی نمل شام میں نہیں، یمن میں ہو اور لشکر کو پہلی آبادی یہی ملے ورنہ شام کی سرحد تو فلسطین سے ملی ہوئی تھی۔

قرآن کریم میں زیرِ بحث آیت جس طرح وارد ہوئی ہے، اُس کا ہر لفظ یا ہر ٹکڑہ اس مفروضہ کی تردید کرتا ہے کہ یہ معاملہ چیونٹیوں"

کا تھا۔ پوری عبارت یوں ہے۔

قَالَتْ نَمْلَةٌ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّمْلُ ٱدْخُلُوا۟ مَسَٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَٰنُ وَجُنُودُهُۥ
وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (۲۷/۱۸)

ایک نملہ نے کہا کہ اے نملیو! اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں ریزہ ریزہ کر دے۔ اور وہ سمجھ نہ سکیں۔"

سب سے پہلی چیز نملہ کا انداز خطاب ہے۔ اسی سورہ میں حضرت سلیمانؑ کا اپنے درباریوں سے خطاب یوں ہے یَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ (۲۷/۳۸)، ملکہ سبا کا اپنے درباریوں سے خطاب یوں ہے یَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ (۲۷/۲۹) اور نملہ کا خطاب یوں ہے یَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّمْلُ (۲۷/۱۸)۔ قرآن میں چرند، پرند، درند ہر قسم کے حیوانوں کا ذکر ہوا ہے اور انھیں ہماری ہی طرح گروہ گروہ أُمَمٌ أَمْثَالُكُم (۶/۳۸) بھی کہا گیا ہے۔ مگر کسی قسم کے حیوان کے لئے اپنے ہم جنسوں یا دوسرے حیوانوں کو خطاب کر کے کچھ کہنے کا مطلقاً کہیں ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آواز نکالنے والے حیوان بھی اپنے ہم جنسوں یا دوسرے حیوانوں کو کبھی خطاب نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ آدمی کے انداز خطاب سے حیوان کا دوسرے حیوانوں کو خطاب کرنا اور وہ بھی ایک چیونٹی کا دوسری چیونٹیوں کو جو بے آواز کیڑا ہے۔ ہُدہُد جو بولنے والا ہے اُس نے بھی حضرت سلیمانؑ کو خطاب کر کے وہ کچھ نہ کہا تھا جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ نملہ کوئی چیونٹی نہیں بلکہ قبیلۂ بنو نمل کی ایک عورت تھی جس نے اپنی قوم کو خطاب کر کے خطرہ اور اس سے بچنے کی تدبیر سے آگاہ کر دیا تھا اور چونکہ ایک سرداری کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی قوم کو کوئی مطلق حکم دے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ وہ نملہ اپنی قوم کی سردار تھی۔

نملہ نے حکم دیا کہ ٱدْخُلُوا۟ مَسَٰكِنَكُمْ۔ ندوی صاحب کا فرمانا ہے کہ "ٱدْخُلُوا۟" جن سے کہا گیا ہے اُن کو انسان ہونا چاہیئے کیونکہ یہ وزن انسانوں سے خطاب کے لئے آتا ہے۔ چیونٹی جیسے کیڑے کی جنس کو مخاطب کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ صیغۂ امر جمع مذکر استعمال کیا جائے۔ "النمل" سے مراد چیونٹی کی جنس ہوتی تو صیغہ امر واحد مونث استعمال ہوتا۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے "النحل" کو مخاطب کر کے "إِنِ ٱتَّخِذِى" کہا۔ چونکہ "النمل" سے "ادخلی" نہیں کہا گیا اور نہ "ادخلن" کہا گیا اس لئے معلوم ہوا کہ "النمل" سے کیڑوں مکوڑوں کی جنس مراد نہیں ہے۔

نہ صرف اتنا بلکہ "مَسَٰكِنَكُمْ" بھی غور طلب ہے۔ نملیوں سے کہا گیا کہ تم اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ۔ اول تو چیونٹیوں کے الگ الگ گھر نہیں ہوتے۔ دوسرے "سوراخوں" کو "مساکن" نہیں بلکہ "اجحار" کہا جاتا ہے۔ تیسرے قرآن میں حیوانوں کے گھروں کو "مسکن" یعنی "سکونت کی جگہ" کہیں بھی نہیں کہا گیا۔ اگر یہاں "بیوتکم" آتا تو گنجائش ممکن تھی۔ کیونکہ "بیت" ایک عام لفظ ہے۔ خدا کے گھر کے لئے بھی "بیت" آیا ہے (۲۲/۲۶) رسول کے گھر کے لئے بھی "بیت" آیا ہے (۳۳/۵۳) عبادت کے گھر کے لئے بھی "بیت" آیا ہے (۲۴/۳۶) انسان کے گھر کے لئے بھی "بیت" آیا ہے (۲۴/۲۹) حیوان کے گھر کے لئے بھی "بیت" آیا ہے (۱۶/۶۸) مگر "مسکن" صرف آدمیوں کی رہائش والی جگہ کے لئے آیا ہے۔ اہل سبا، اسی جنوبی عرب کے خطۂ یمن کے رہنے والے تھے اُن کی رہائش کی جگہوں کو

"مسکن" کہا گیا ہے (۳۴/۱۵) عاد بھی اسی خطۂ ارضی کے رہنے والے تھے۔ ان کے مقامِ رہائش کے لئے بھی "مسکن" کا لفظ آیا ہے۔ (۲۶/۴۶) سورۂ سجدہ میں ہر انسانی رہائش گاہ کے ذکر میں "مسکن" کا لفظ آیا ہے۔

كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ. (۳۲/۲۶)

"ہم ان سے پہلے کتنی ہی امتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کے مقاماتِ سکونت میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔"

سورۂ عنکبوت میں جب "انسانوں" کی رہائش گاہوں کا ذکر ہوا ہے تو "مسکن" کا لفظ آیا ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودَا وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ (۲۹/۳۸)

اور عاد و ثمود کو بھی ہلاک کر دیا گیا اور اُن کی ہلاکت اُن کی جائے سکونت

سے تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔"

لیکن اسی سورہ میں جب "حیوانوں" کے گھر کا ذکر آیا تو "بیت" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ (۲۹/۴۱)　　　"تمام گھروں سے زیادہ بودا گھر کڑی کا ہے۔"

یہاں تک کہ جب انسانوں کے خالی گھروں کا ذکر ہوا ہے تو کہا گیا ہے:

بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ (۲۴/۲۹)　　　"ایسے گھروں میں جو سکونتی نہ ہوں"

غرض قرآن میں "مسکن" کا لفظ "حیوانوں" کے گھروں کے لئے نہیں آیا۔ اور یہاں "نملہ" نے "اپنے اپنے مسکن" میں داخل ہونے کو کہا تھا جس سے ظاہر ہے کہ وہ انسان تھے جن کی سکونت کی اپنی اپنی جگہیں متعین تھیں۔ لہٰذا یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ آبادی انسانوں کی تھی، حیوانوں کی نہیں۔

"چیونٹیوں" کے ہوا خواہوں نے "حطم" کا ترجمہ کچلنا کیا ہے اور "انسانوں" کے ہمدردوں نے اس کا ترجمہ "روندنا" کیا ہے۔ ندوی صاحب نے کہا ہے کہ اس لفظ کا صحیح ترجمہ ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ انھوں نے قرآن سے تین حوالے بھی دیئے ہیں ان تینوں مقامات پر زراعت کے سلسلے میں لفظ "حطٰم" استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ عام طور پر "چورا چورا کرنا" کیا جاتا ہے۔ یعنی ریزہ ریزہ ہونا قرآن کا لغت خود قرآن ہے۔ اب خود سوچا جا سکتا ہے کہ جو لفظ قرآن میں زراعت کی تباہی یا آخری کیفیت کے لئے استعمال ہوا ہے وہی لفظ نملہ کے اندیشۂ بربادی کے اظہار کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔ ذرا سوچئے کہ چیونٹی انسان یا حیوان کے پیروں کے نیچے آکر پس جاتی اور "نسیاً منسیاً" ہو جاتی ہے یا "چورا چورا" ہوتی ہے؟ اور پھر ایک عظیم لشکر کے پاؤں تلے؟

اب رہا یہ کہ یہ آواز عورت (نملہ) نے کیوں دی؟ اور وہ کون تھی؟ سو یہ بھی واضح ہے۔ شمالی عرب کے جو کتبات برآمد ہوئے ہیں اُن میں کئی قدیم عرب خواتین کا ذکر ہے جو حکومتوں کی سربراہ تھیں۔ جنوبی عرب کی ایک مملکت کی سربراہ عورت (ملکہ سبا) کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے۔ پھر اسی علاقہ کی ایک عورت کے قبیلۂ سردار ہونے پر تعجب نہیں کیا جا سکتا۔ سو جب اس سردار عورت نے لشکر سلیمانی کو دیکھا تو اپنی قوم کی تباہی کا اندیشہ کر کے فوراً اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ قرآن میں کوئی قصہ بے مقصد بیان نہیں ہوا۔ اُن میں کچھ نہ کچھ درس اور سبق ضرور ہے۔ کوئی نہ کوئی عبرت و بصیرت کا پہلو موجود ہے۔ اب اگر اس قصہ کا تعلق واقعی چیونٹیوں سے ہے تو اس میں کیا درس و سبق ہے، بسوائے اس کے کہ جب کوئی فوج کسی مہم پر جائے تو یہ خیال رکھے کہ چیونٹی بھی نہ مرے؟ مودودی صاحب کی طرح جناب حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے بھی ایک مصری عالم کا مضحکہ اڑایا ہے جس نے کہا ہے کہ وادیٔ نمل میں چیونٹیاں نہیں آدمی تھے۔ اور فرمایا ہے کہ

"زکی پاشا کی یہ تغیر آیت کی تفسیر نہیں بلکہ اس کی مراد کی تحریف ہے"۔

اور اگرچہ وہ ہر قرآنی قصے میں عبرت و سبق کے قائل ہیں مگر اس واقعہ سے متعلق کوئی نکتہ انھوں نے بھی بیان نہیں فرمایا کہ جب یہ چیونٹیوں کا معاملہ تھا تو اس میں عبرت و بصیرت کا کیا نکتہ تھا؟

مودودی صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر نملہ کوئی عورت تھی تو اس کا یہ اعلان بے معنی تھا۔ دلیل یہ ہے کہ

"حملہ آور فوج کا دستور ہے کہ ہتھیار پھینک کر گھروں میں گھس جانے والے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتی"۔

مودودی صاحب کا یہ حتمی فیصلہ اگر غیر قرآنی فکر و مطالعہ کا نتیجہ ہے تو کیا کہا جاسکتا ہے، ورنہ قرآنی ضابطہ تو یہ ہے (وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ) کہ:-

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (۴/۹۰)

سو اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش رہیں اور جنگ نہ کریں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ نے تم کو اُن پر کوئی راہ نہیں دی ہے۔

اس کا عملی ثبوت خود رسول اللہ کی سیرت سے ملتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے ابوسفیان کو مخاطب کر کے اعلان فرمایا تھا کہ

"جو کوئی تیرے گھر میں یا اپنے گھروں میں یا مسجدِ حرام میں پناہ گزیں ہوگا یا جو ہتھیار ڈال دے گا اُسے اماں دی جائے گی یا جو ایمان لے آئے گا وہ محفوظ و مصئون رہے گا"۔ (خاتم النبیین از سحاب قزلباش ص ۱۴۹)

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

"اسے کہنا چاہیے تھا کہ اے نملیو! بھاگ چلو، پہاڑوں میں پناہ لو"۔

کیونکہ:-

"حملہ آور فوج اس دشمن کا پیچھا نہیں کیا کرتی جو خود کو کمزور پا کر پہاڑوں میں جا چھپتا ہے"۔

وہ تو بیچاری ایک ناقص العقل عرب عورت تھی۔ اتنی سوجھ بوجھ عسکری رموز و اسرار سے واقفیت کہاں رکھتی تھی کہ اہلِ نمل کو پہاڑوں میں پناہ لینے کا مشورہ یا حکم دیتی۔ مگر اہلِ مکہ جو مرد اور شجاعانِ عرب میں سے تھے اور سارے فوجی طریق و انداز سے باخبر تھے،

باوجود پہاڑوں کی موجودگی کے، پہاڑوں میں نہ گئے تھے اور نہ کسی نے بھی ان کو یہ مشورہ دیا تھا بلکہ

"تمام اہالیانِ مکہ کچھ ہتھیار ڈال کر، کچھ گھروں کے دروازے بند کر کے، کچھ مسجد حرام میں اور کچھ ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔"

اور رسول اللہ نے ہتھیار پھینک کر گھروں میں گھس جانے والے دشمنوں کو نہایت اطمینان سے معاف فرما دیا تھا۔

اس سردار عورت (نملہ) نے جو کچھ اپنے قبیلہ والوں سے کہا تھا وہ اتنا ہی تھا کہ ایک لشکر جرار آ رہا ہے تم ان کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا تم بھی ان سے لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن فوج کے سامنے آنا بہرحال خطرہ کا موجب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ غیر شعوری طور تمہیں نقصان پہنچا دیں۔ اور وہ لشکر ایسا زبردست ہے کہ اس کی ذرا سی جھڑپ سے بھی تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے۔

بہرکیف! ندوی صاحب کا مقالہ بہت قیمتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وادیٔ نمل شمالی عرب یعنی علاقہ شام میں نہیں بلکہ جنوبی عرب یعنی خطۂ یمن میں تھی اور وہاں "چیونٹیاں" نہیں بلکہ "انسان" رہتے تھے۔ "نملہ" کوئی چیونٹی نہیں بلکہ "عورت" تھی اور جس طرح "توراۃ" میں قومِ عاد کی عورت کو "عادہ" کہا گیا ہے، قبیلۂ بنو نمل کی ایک عورت کو قرآن نے "نملہ" کہا ہے۔ البتہ ندوی صاحب نے حضرت سلیمانؑ کے اس فوجی سفر سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ مزید غور کا محتاج ہے۔ ایک جگہ (صفحہ ۵۳) انھوں نے فرمایا ہے کہ

جس خبر کو سن کر حضرت سلیمانؑ لاؤ لشکر لے کر یہاں آئے تھے وہ خبر سبا سے متعلق تھی۔

مگر اس سے پہلے اسی صفحہ میں فرماتے ہیں کہ:-

"لاؤ لشکر لے کر حضرت سلیمانؑ یہاں سیاحی کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ یہاں کے باشندوں سے... کسی وجہ سے لڑنے کو آئے تھے۔ لیکن ایک نملہ نے لڑائی نہ ہونے دی۔

قرآن میں جس انداز میں یہ قصہ بیان ہوا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی یہ فوجی مہم نہ تو وادیٔ نمل والوں کے خلاف تھی اور نہ ملکۂ سبا کے خلاف۔ بلکہ دونوں واقعے دورانِ سفر میں ضمناً پیش آ گئے تھے۔ یوں کہ جب وہ اپنی فوج کے ساتھ کسی مہم پر جا رہے تھے تو راستہ میں وادیٔ نمل ملی۔ اور وہاں کے لوگوں نے خانہ نشین ہو کر اپنے کو اس طرح پُرامن اور غیر متحارب ظاہر کیا کہ حضرت سلیمانؑ خدا کے ان بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا پروگرام بنا کر وہیں خیمہ زن ہو گئے۔ اداشکر کے بعد آپ کا یہ فرمانا کہ

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ (۲۷/۱۹)

"اور یہ کہ میں کوئی نیک کام ایسا کروں جسے تو پسند کرے۔"

ظاہر کرتا ہے کہ وہ وادیٔ نمل والوں کے لئے کچھ مفید کام سرانجام دینا چاہتے تھے۔ اور اُن کی فلاح و بہبود کی اسکیم سوچ کر اُسے عملی شکل

دیے گئے تھے وہاں ٹھہر گئے تھے اور وہیں وہ دربار منعقد ہوا تھا جس میں ہُدہُد غیر حاضر پایا گیا تھا اور پھر اس نے حاضر ہو کر ملکہ سبا سے متعلق اطلاعات بہم پہنچائی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے ملکہ سبا کے متعلق انھیں کوئی اطلاع نہ تھی۔ کیونکہ نہ صرف ہُدہُد نے ملکہ سبا کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ

اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ (۲۷/۲۲)　　"میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو علم نہیں"

بلکہ خود حضرت سلیمانؑ نے بھی فرمایا تھا کہ

سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۲۷/۲۷)

"اچھا میں ابھی دیکھے لیتا ہوں کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں ہے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وادیٔ نمل میں پہنچنے اور اس انعقادِ دربار سے پہلے تک اُن کو ملکہ سبا سے متعلق کوئی اطلاع نہ تھی۔ انھیں پہلی مرتبہ اس ملکہ اور اس کی حکومت و آفتاب پرستی کی اطلاع اسی موقع پر ملی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دور دراز علاقہ میں عسکری مہم پر جانے کی حضرت سلیمانؑ کو کیا خاص ضرورت پیش آئی تھی؟ سو حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ قرآن نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ اور اصل فوج کشی کے سبب کا ذکر غیر ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اس میں کوئی درس و عبرت نہیں۔ البتہ توراۃ کے اندراجات اور اثری اکتشافات کی بنا پر اس مسئلے میں کچھ کہا جا سکتا ہے اور میں ایک رائے رکھتا بھی ہوں مگر اُس کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ کیونکہ مسئلہ زیر بحث کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

موضوع بحث ختم ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مجھے ایک خاص بات کہنی ہے۔ سورۂ نمل سے پہلے سورۂ شعرا ہے اور سورۂ نمل کے بعد سورۂ قصص ہے۔ اور یہ دونوں اگلی اور پچھلی سورتیں حروفِ مقطعات "طٰسٓمٓ" سے شروع ہوتی ہیں اور درمیانی سورۂ نمل "طٰسٓ" سے۔ "طسم" قوم عاد کا ایک قبیلہ تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے "ارض القرآن" جلد اوّل میں لکھا ہے کہ "طسم" کا نام ہلاکت و بربادی کی عبرت کے لیے اس قدر مشہور ہے کہ عربی زبان میں "طسم" کے معنی خود "بربادی" ہو گئے ہیں۔ انھوں نے جاہلی شاعر سلمیٰ بن ربیعہ کا ایک شعر پیش کیا ہے جس میں وہ اہل مارب اور قبیلہ "لقمان" وغیرہ سے پہلے "طسم" کی ہلاکت کا ذکر کرتا ہے۔ صاحب "ارض القرآن" نے "طسم" کا (مختصر ہی سہی) ذکر کیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں قرآن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ابو الجلال صاحب ندوی کے مقالہ "نمل اور نملہ" پر ادارہ کا جو نوٹ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ندوی صاحب نے سورۂ شعرا، نمل اور قصص سے متعلق کچھ فرمایا تھا جو عدم گنجائش کے سبب شائع نہ ہو سکا۔ پتہ نہیں انھوں نے اس موضوع پر بھی کچھ لکھا تھا یا نہیں؟[۱] یہ عجیب بات ہے کہ یہ تینوں سورتیں یکے بعد دیگرے آتی ہیں اور یوں شروع ہوتی ہیں۔

---

[۱] مولانا ندوی نے اپنے مضمون میں ان سورتوں کے ترتیبِ نزول سے بحث کی تھی حروفِ مقطعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا تھا۔　　(طلوعِ اسلام)

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ (شعرا)

طٰسٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (نمل)

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ (قصص)

یہ حروفِ مقطعات یہاں کے علاوہ اور کہیں نہیں آئے۔ سورہ شعرا اور قصص کے حروفِ مقطعات ہی ایک نہیں بلکہ دونوں کی پہلی آیت بھی ایک ہی ہے۔ سورہ نمل درمیانی سورہ ہے اُس کے حروفِ مقطعات میں آخری حرف (م) کی کمی اور پہلی آیت میں القرآن کا اضافہ ہے "طسم" ایک عرب قبیلہ کا نام ہے۔ لقمٰن اور نمل بھی قبائل کے نام ہیں۔ ابن خلدون کی بات صحیح تسلیم کی جائے تو "طسم" کی سکونت بحرین میں تھی۔ کلبی کا کہنا ہے کہ یہ قبیلہ یمامہ میں تھا۔ بحرین عجم میں ہے اور یمامہ عرب میں۔ سلمیٰ کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ یہ قبیلہ عرب ہی میں تھا اور یمن ہی کے علاقہ میں تھا کیونکہ وہ "طسم" کے بعد شاہ یمن اور اہل مارب کی تباہی کا ذکر کرتا ہے۔ قبیلۂ نمل اور لقمان بھی یمن ہی میں تھا۔ بہرکیف! ان تینوں سورتوں کا مسلسل ہونا، حروفِ مقطعات اور پہلی آیات میں یکسانیت و مماثلت "طسم" اور نمل قبیلہ کا نام ہونا کوئی خاص معنی رکھتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا؟ علامہ ابوالجلال صاحب ندوی نے اپنے مقالہ "نقوشِ صحرا"[1] میں "طسم" کا مطلب سماتی نقوش کی بنا پر "گلا گھونٹنا حرام ہے، روشنی برسنے کو ہے" ظاہر کیا ہے۔ سورۂ شعرا میں تو اس کی چول ٹھیک بیٹھ جاتی ہے مگر سورۂ قصص میں بھی یہی "طسم" ہے اور وہاں اس کا کوئی مفہوم چسپاں نہیں ہوتا۔ اور سورۂ نمل میں اسی سماتی حل کو قبول کیا جائے تو پھر "طس" کا کوئی مطلب متعین نہیں ہوتا۔ ندوی صاحب کا یہ فرمانا تو بجا ہے کہ یہ حروفِ مقطعات اُس عہد میں اتنے ہی عام اور آسان تھے کہ نہ تو کسی مومن نے رسول اللہ سے کسی ایک کی تشریح چاہی اور نہ کسی کافر نے کبھی ایک پر بھی اعتراض کیا۔ لیکن اُن کا یہ ارشاد کچھ جی کو نہیں لگتا کہ حروفِ مقطعات درحقیقت سماتی کتبے ہیں۔ یعنی وہ نشانات جو اونٹوں کے مختلف اعضا پر داغ دے کر بنائے جاتے تھے[2]۔

---

[1] جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے مولانا صاحب کا یہ مضمون رسالہ ماہِ نو (کراچی) میں شائع ہوا تھا۔ (طلوع اسلام)

[2] حروفِ مقطعات کے متعلق کوئی اطمینان بخش بحث ابھی تک ہماری نظروں سے بھی نہیں گذری۔ (طلوع اسلام)

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور

سے خط و کتابت کا پتہ

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

تمام احباب نوٹ فرمالیں۔

(نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور)

اسلام کی سرگزشت

(مسلسل)

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، اعتزال کی ابتداء بصرہ میں ہوئی اور بہت تیزی کے ساتھ سارے عراق میں پھیل گئی۔ خلفائے بنوامیہ میں سے یزید بن ولید اور مروان بن محمد نے اس مذہب کو قبول کر لیا۔ عباسی دورِ خلافت میں اعتزال کے دو بڑے اسکول قائم ہو گئے تھے۔ ایک بصرہ کا اسکول تھا اور دوسرا بغداد کا۔ بصرہ اور بغداد کے معتزلیوں میں بہت سے مسائل میں اختلافات بھی تھے جن میں باہم مباحثے ہوتے رہتے تھے

معتزلہ اور یونانی علوم

اسلامی فرقوں میں سب سے زیادہ معتزلہ نے یونانی فلسفہ سے استفادہ کیا اور اسے اسلامی رنگ میں رنگا۔ کیونکہ اس سے انھیں اپنے نظریات قائم کرنے اور مباحثے وغیرہ کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ جن لوگوں نے فلسفہ سے بڑا کام لیا ان میں سب سے زیادہ مشہور ابوالہذیل علاف۔ نظام اور جاحظ ہوئے ہیں۔ ہم یہاں یہ بیان نہیں کر سکتے کہ یونانی نظریات کیا تھے اور انھیں ائمہ معتزلہ نے اپنے ہاں کس طرح منتقل کیا۔ کیونکہ اس کا مقام وہ ہوگا جہاں ہم دولتِ عباسیہ کے ابتدائی دور میں حرکتِ عقلیہ پر گفتگو کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

معتزلہ نے علمِ کلام کو جنم دیا

سچ یہ ہے کہ معتزلہ ہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے اسلام میں علمِ کلام کو جنم دیا اور وہی مسلمانوں میں سے پہلے لوگ ہیں جنھوں نے خود کو اپنے دین کے دشمنوں کے ہتھیاروں سے مسلح کیا۔ بات یہ تھی کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ان لوگوں کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے جو یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور دہریوں میں سے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان کے سروں میں اب تک ان کے پرانے مذاہب بھرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ شہادتین کا زبان سے اقرار کر لیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ہی بڑی تیزی سے ان لوگوں نے اسلام میں وہی مسائل ابھارنے شروع کر دیئے جو ان کے مذاہب میں ابھارے جاتے تھے۔ یہ تمام مذاہب جن کا ہم نے ذکر کیا ہے یونانی فلسفہ اور یونانی منطق سے پہلے ہی اچھی طرح مسلح تھے۔ انھوں نے ان مسائل پر بحث کرنے کے طریقہ کو کافی منظم کیا ہوا تھا اور اس میں وہ

بڑی گہرائی تک پہنچے ہوئے تھے۔ اب ان لوگوں نے اسلام پر حملے شروع کئے۔ اسلام ایک ایسا دین تھا جو اپنے عقیدہ کی سادگی میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے شکوک پیدا کرنے شروع کئے۔ یہ کام صرف ان لوگوں نے ہی نہیں کیا جو اسلام لے آئے تھے بلکہ بلاد اسلامیہ ان مختلف مذاہب کے متبعین اور پیروکاروں سے بھرے ہوئے تھے جو اب تک اپنے مذاہب پر باقی تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ دولتِ بنوامیہ کے شاہی محلات میں بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ ان نومسلموں اور ان غیر مذاہب والوں' دونوں نے مل کر تقدیر کا مسئلہ بالکل اسی طرح فلسفیانہ انداز سے اٹھایا جیسا کہ ان کے مذاہب میں معروف تھا۔ ساتھ ہی صفاتِ خداوندی اور خلقِ قرآن کے مسائل بھی کھڑے کر دیئے۔ نصرانیت میں اس قسم کے سوالات پہلے سے موجود تھے۔ اس کے علاوہ زردشتیوں نے بھی بہت سے نئے مسائل کھڑے کر دیئے۔

مخالفین کے رد میں معتزلہ کی خدمات

ان تمام باتوں نے مل کر معتزلہ کو مجبور کیا کہ وہ بھی اپنے دشمنوں کے ہتھیاروں سے مسلح ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ان کے ساتھ علمی مباحثات کئے اور جبر کے قائلین اور منکرینِ خدا کے اقوال کا رد کیا۔ اور جو شکوک و شبہات یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں نے پیدا کر رکھے تھے ان کا ازالہ کیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ واصل بن عطا کے بارے میں مرتضیٰ نے نقل کیا ہے کہ "وہ غالی شیعہ، بددین خوارج، زنادقہ، دہریہ، مرجئہ اور تمام مخالفین کی باتوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔" ان کے اقوال معلوم کر لینے کے بعد وہ اس فصاحت و بلاغت سے ان کا رد کرتے تھے کہ بشار نے ان کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے۔

وَقَالَ مُرْتَجِلاً تَغْلِيْ بَدَاهَتُهُ ۔۔۔ كَمِرْجَلِ الْقَيْنِ لَمَّا حُفَّ بِاللَّهَبِ

(وہ فی البدیہہ اس طرح بولتے اور ان کی بدیہہ گوئی اس طرح جوش مارتی تھی جیسے لوہار کی ہانڈی شعلوں میں لپٹ جانے کے بعد جوش کھایا کرتی ہے)

واصل بن عطا کی بیوی واصل کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ ۔۔۔۔ جب اندھیری رات چھا جاتی تو وہ اپنے قدموں[1] پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ کاغذ، قلم، دوات ان کے قریب رکھے رہتے تھے۔ اگر نماز کی قرأت کے دوران کسی آیت پر سے گذرتے جس میں مخالفین کے خلاف حجت ہوتی تو بیٹھ کر اس کے متعلق لکھنا شروع کر دیتے۔ اور اس سے فارغ ہو کر پھر نماز پڑھنا شروع کر دیتے۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف شہروں میں اپنے داعی بھیجتے رہتے تھے۔ جو مخالف تعلیمات والوں سے مناظرے کرتے اور اپنے عقائد کو پھیلاتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ ابن الحارث کو واصل بن عطا نے بلاد مغرب کی طرف بھیجا تھا اور حفص بن سالم کو خراسان کی طرف جس نے وہاں جا کر جہم سے مناظرہ کیا جو جبر کا قائل تھا۔ اسی طرح انھوں نے یمن، جزیرہ اور آرمینیہ کی طرف بھی اپنے داعیوں کو بھیج رکھا تھا۔ انہی موضوعات پر واصل کتابیں بھی تصنیف کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں ہزار مسائل تھے۔ یہ کتاب مانوی مذہب کے رد میں تھی ۔۔۔۔ یہی حال عمرو بن عبید کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنے مخالفین سے مناظرہ کرتے اور نہایت مہارت کے ساتھ لوگوں کو اعتزال کی طرف دعوت دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی توصیف کرتے ہوئے ایک صاحب

نے کہا ہے کہ "عمرو بن عبید کو آپ آتا ہوا دیکھیں تو یوں معلوم ہوگا جیسے اپنے والدین کو دفن کر کے آ رہے ہوں۔ ان کو بیٹھا ہوا دیکھیں تو یوں معلوم ہوگا جیسے قصاص لینے کے لئے ان کو بٹھلایا گیا ہو۔ انھیں بولتا ہوا دیکھیں تو ایسا نظر آئے گا جیسے جنت اور دوزخ صرف ان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔" عمرو بن عبید اور ان کے ساتھیوں نے ــــ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ــــ حکومت کے کسی کام میں شریک ہونے کو پسند نہیں کیا اور اس سے انکار کر دیا۔ ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ ان کا ہر کام خالص خدا کے لئے ہو۔ چنانچہ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ "عمرو بن عبید نے ابو جعفر منصور سے کہا کہ "خدا نے تمہیں اپنی پوری دنیا عطا فرما دی ہے۔ اس کا کچھ حصہ دے کر اپنی جان کو خرید لو۔ اس رات کو یاد کرو جو ایسے دن سے پہلے آئے گی جس کے بعد کوئی دوسری رات آنے والی نہیں ہوگی۔" عمرو بن عبید کی باتوں سے منصور بہت متاثر ہوا تو ربیع نے عمرو بن عبید سے کہا کہ "اے عمرو! تم نے تو امیر المومنین کو آزردہ خاطر کر دیا ہے۔ عمرو بن عبید نے منصور سے کہا کہ اس شخص نے پورے بیس سال تیرے ساتھ گذارے ہیں مگر اسے اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ایک دن بھی تیرے لئے ایسا نکال سکتا جس میں وہ تجھے خیر خواہی کی بات بتا سکتا۔ تیرے دروازے سے الگ ہو کر بھی اس نے نہ کتاب اللہ کا کوئی کام کیا اور نہ رسول اللہؐ کی سنت کا۔" اس پر ابو جعفر نے کہا کہ بتایئے نا آخر میں کیا کروں؟ میں تو کہہ چکا ہوں کہ میری انگشتری اپنے ہاتھ میں لے لیجئے۔ آیئے اور اپنے اصحاب کو بھی ساتھ لے آیئے اور امور حکومت میں میرا ہاتھ بٹایئے۔ عمرو بن عبید نے کہا کہ ہمیں اپنے عدل و انصاف کے ساتھ دعوت دو تاکہ ہمارے نفوس تیری مدد کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ آپ کے دروازے پر ہزاروں ظلم ہو رہے ہیں۔ ان مظالم میں سے کچھ کو تو دفع کر کے دکھایئے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں[1]۔ لیکن اس کے باوجود معتزلہ اکثر

معتزلہ عوام میں مقبول نہیں تھے

مسلمانوں کی نگاہوں میں ناپسندیدہ تھے جس کے چند اسباب تھے۔ ان میں سے اہم ترین سبب یہ تھا کہ وہ اکثر آراء میں اہل حدیث کے خلاف تھے۔ محدثین ان پر سخت سے سخت حملے کرتے تھے۔ ان میں سے ایک چیز یہ بھی تھی کہ ان لوگوں نے اسلام کے سادہ عقیدے کو گہرے فلسفیانہ عقیدہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ مامون اور معتصم کے عہد حکومت میں معتزلہ نے خلق قرآن کے قول میں لوگوں کو سخت ایذائیں پہنچائیں اور اپنی رائے کو دلائل سے ثابت کرنے پر اکتفا نہیں کیا جو فلسفیانہ انداز ہوا کرتا ہے بلکہ انھوں نے لوگوں کو تلوار کے ذریعہ اپنی رائے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جن کی وجہ سے ان کے اقتدار اور شہرت کو کافی نقصان پہنچا۔ اور شاید ان اسباب ہی میں سے ایک یہ چیز بھی تھی کہ انھوں نے صحابہؓ کو وہی رتبہ دیا جو عام مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان کی معصومیت کا اعتراف نہیں کیا بلکہ جرأت کر کے ان کے اعمال کی تشریح و تحلیل شروع کر دی کہ ان کی بعض باتوں کو وہ صحیح قرار دیتے تھے اور بعض کو غلط۔ آپ عمرو بن عبید کے اقوال پہلے دیکھ چکے ہیں۔ ان کے بعد نظام ہوئے۔ جنھوں نے حضرت عمرؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی بعض باتوں پر تنقید کی۔ حذیفہؓ اور ابو ہریرہؓ کو ایک طویل گفتگو میں جھٹلایا[2]۔

---

[1] عیون الاخبار صفحہ ۳۳۷ ج ۲۔ [2] اس قول کو بالتفصیل مع اس کی تردید کے کتاب تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ میں دیکھئے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱ وما بعدہا

بحث و مناظرے

بنو امیہ کے دورِ حکومت ہی میں ان مذکورہ بالا مذاہب — خوارج، شیعہ، مرجئہ اور معتزلہ وغیرہ میں — باہمی بحث و مناظرے شروع ہو چکے تھے۔ تاریخ، ادب اور مذاہب کی کتابیں ان شدید مباحثوں سے بھری پڑی ہیں جو ان کے درمیان ہوتے رہتے تھے۔ ابن ابی الحدید نے بیان کیا ہے کہ خوارج — مہلب سے جنگ و پیکار کے دوران — کچھ اوقات کے لئے اپنی تلواریں رکھ دیتے اور مقابل کے لوگوں سے ملتے اور ان سے بحث کر کے انھیں اپنے مذہب کی دعوت دیتے تھے۔ اغانی کا بیان ہے کہ ثابت قطنہ نے کچھ خارجیوں کو سنا کہ وہ خراسان میں مرجئہ فرقہ کے لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے بحث کرتے تھے۔ ثابت کو مرجئہ فرقہ کے لوگوں کی باتیں پسند آئیں اور وہ ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اپنا وہ مشہور قصیدہ کہا جسے ہم نے مرجئہ کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ آغانی ہی کا بیان ہے کہ ایک شیعی اور ایک مرجئی جھگڑتے ہوئے فیصلہ کے لئے اس آدمی کے پاس گئے جو سب سے پہلے ان کے سامنے آجائے۔ اتفاق سے سب سے پہلے "دلال" آگیا۔ اور ان دونوں نے اس سے پوچھا کہ ان دونوں میں سے کون سا بہتر ہے۔ شیعی بہتر ہے یا مرجئی؟ دلال نے جواب میں کہا کہ میں اس کے متعلق تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا اوپر کا آدھا حصہ شیعی ہے اور نیچے کا آدھا حصہ مرجئی۔[1]

ابن نباتہ کا بیان ہے کہ یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ شعراء بھی اس سے اثر پذیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ذوالرمہ قدری تھا اور رؤبہ جبری تھا۔ ان دونوں کا آپس میں جھگڑا ہوا تو رؤبہ نے کہا کہ "خدا کی قسم کوئی پرندہ آشیانہ تلاش نہیں کرتا اور کوئی درندہ کسی شکار کو نہیں پھاڑتا۔ مگر یہ سب کچھ اللہ کی قضاء و قدر سے ہوتا ہے۔" اس پر ذوالرمہ نے کہا کہ "خدا کی قسم خدا نے بھیڑیے کے لئے یہ مقدر نہیں کیا کہ وہ غریب عیالدار آدمی کا دودھ کا جانور پھاڑ کر کھا جائے۔"

ایک رجز خواں کہتا ہے۔

یَا اَیُّهَا الْمُضْمِرُ هَمًّا لَا تَهُمْ   اِنَّكَ اِنْ تُقْدَرْ لَكَ الْحُمَّى تُحَمْ

وَلَوْ عَلَوْتَ شَاهِقًا مِنَ الْعَلَمْ   كَيْفَ تَوَقِّيكَ وَقَدْ جَفَّ الْقَلَمْ

(اے دل میں غم و فکر کو چھپانے والے غمگین نہ ہو۔ تمہاری شان تو یہ ہے کہ اگر تمہارے لئے گرم ہونا مقدر ہو چکا ہے تو تم گرم ہو کر رہو گے۔ اگر تم ملند سے ملند تر پہاڑ پر بھی چڑھ جاؤ تو تم تقدیر کے فیصلہ سے کس طرح بچ سکتے ہو جبکہ قلم بھی فیصلہ کرنے کے بعد خشک ہو چکا ہے)

آغانی نے ابن قتیبہ سے نقل کیا ہے کہ طرماح اور کمیت کے مابین نہایت دوستی محبت اور خلوص تھا حالانکہ ان کے مذہب، عصبیت اور دیانت میں بڑا فرق تھا۔ کمیت شیعہ اور عدنانی متعصب تھا۔ یہ قبیلہ مضر کے شاعروں میں سے تھا جو اہل کوفہ کے لئے بڑا تعصب رکھتا تھا اور طرماح خارجی صفری تھا۔ قحطانی تھا۔ اس لئے شعراء یمن میں سے بنو قحطان کے لئے بڑا تعصب رکھتا تھا۔ اسے اہل شام سے خاص لگاؤ تھا ان سے پوچھا گیا کہ ان تمام اختلافات کے باوجود تمہارے درمیان آخر کس بات پر اتفاق ہوا ہے؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ ہم دونوں

---

[1] مطلب یہ کہ عقلی اور قلبی محبت تو حضرت علیؓ کے ساتھ ہے مگر خواہشاتِ نفسانی میں وہ مرجئہ کے ساتھ ہے کیونکہ وہ گناہوں کی وجہ سے کسی کو کافر نہیں بناتے

اس امر پر متفق ہیں کہ عوام کو ہمیشہ ناپسند کرنا چاہیئے اور ان سے کبھی علاقہ نہیں رکھنا چاہیئے۔[۵]

بحث کا انداز

آغانی ہی کا بیان ہے کہ بصرہ میں علمائے کلام میں سے چھ آدمی سربرآوردہ شمار ہوتے تھے۔ عمرو بن عبید، واصل بن عطار، بشار اعمٰی، صالح بن عبد القدوس، عبد الکریم ابن ابی العوجاء، اور ایک قبیلۂ ازد کے عالم دیہ جریر ابن حازم تھے، یہ سب ان ازدی بزرگ کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے اور وہیں بحث مباحثہ کیا کرتے عمرو اور واصل تو اعتزال کی طرف نکل گئے، عبد الکریم اور صالح نے دل سے توبہ کر لی۔ بشار حیرانی کے عالم میں رہ گئے اور کسی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکے۔ رہ گئے ازدی تو وہ سُمنیہ کے قول کی طرف مائل ہو گئے (سُمنیہ ہندوستان کے مذاہب میں سے ایک مذہب کا نام ہے)۔ صاحب آغانی کہتے ہیں کہ عبد الکریم نوجوان لوگوں کو اپنی دعوت سے بگاڑتے تھے۔ عمرو بن عبید نے اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک اسے بصرہ سے نکلوا نہیں دیا۔ بلکہ اس کے بعد ایک آدمی کو اس کے پیچھے لگا دیا جس نے اسے قتل کر دیا۔

امام احمد کا بیان ہے کہ جہم بن صفوان کی کسی سُمنی سے ملاقات ہوئی۔ تو سُمنی نے ان سے کہا کہ "کیا تم یہ بات نہیں مانتے کہ تمہارا کوئی خدا ہے؟" جہم نے کہا کہ "ہاں مانتا ہوں" سُمنی نے کہا کہ کیا تم نے اپنے خدا کو دیکھا ہے؟ جہم نے کہا کہ "نہیں" سُمنی نے کہا کہ کیا تم نے اس کی بات سنی ہے؟ جہم نے کہا کہ "نہیں" سُمنی نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کو بو سونگھی ہے؟ جہم نے کہا کہ "نہیں" سُمنی نے کہا کہ پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خدا ہے؟ جہم نے اس سے کہا کہ "کیا تم اس بات کو مانتے ہو کہ تمہارے اندر جان ہے؟" سُمنی نے کہا کہ "ہاں مانتا ہوں"۔ جہم نے پوچھا کہ "کیا تم نے اپنی جان دیکھی ہے؟" سُمنی نے کہا "نہیں"۔ جہم نے پوچھا کہ "کیا تم نے اس کی بات سُنی ہے؟" سُمنی نے کہا "نہیں"۔ جہم نے پوچھا کہ "کیا تم نے اسے کسی طرح محسوس کیا ہے؟" سُمنی نے کہا "نہیں" جہم نے کہا "تو بس خدا کا حال بھی یہی ہے"۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی مذاہب اور ان سیاسی آراء میں جن پر دین کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا بحث و مباحثہ کی حرکت اس زمانہ میں ایک بڑی حرکت بن گئی تھی۔ اور علم، سیاست اور ادب پر اس کا گہرا اثر تھا۔ یہ تمام فرقے ان مختلف قسم کی عقلیتوں کی پیداوار تھے جو ایران، روم، سریان اور عرب وغیرہ سے ترکیب پائی ہوئی تھیں۔ یہ تمام عقلیتیں مختلف ادیان، یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور بُت پرستی پر ایمان رکھی تھیں۔ اگر امتِ اسلامیہ صرف امتِ عربیہ ہوتی تو اس میں ہمیں صرف خوارج اور مرجیہ جیسے فرقے ہی مل سکتے تھے۔ ان میں ہمیں شیعۂ غالیہ کے مذاہب، ان کی عجیب و غریب تعلیمات اور معتزلہ کی فلسفیانہ ابحاث اور ان کے گہرے مذاہب نہیں مل سکتے تھے۔

یہ علمی حرکات جن کو ہم نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور وہ دینی فرقے جن کی تعلیمات ہم نے وضاحت سے بیان کر دی ہیں۔ دولتِ امویہ میں سادہ حالات پر تھے۔ منظم قواعد کے درجے تک نہیں پہنچے تھے۔ اس درجہ تک وہ عباسی دورِ حکومت کے ابتدائی عہد میں پہنچ سکے کیونکہ دولتِ عباسیہ کے خلفاء علمی حرکت کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان بنیادوں کو بلند کرنے میں لگے رہتے تھے جو اموی دورِ حکومت میں ڈالی جا چکی تھیں۔ اس میں انھوں نے ان کتابوں کے تراجم سے بھی بڑی مدد لی جو ان تک گذشتہ امتوں کی کتابوں کی صورت میں پہنچی تھیں۔ اس پر ہم آئندہ جلد میں بحث کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے لئے ہم خدا ہی سے مدد کے طلب گار ہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن

سابقہ اعلانات سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ

(۱) امسال طلوع اسلام کنونشن، ۸-۹-۱۰ اپریل کو لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ کنونشن، حسب سابق، بہترین ہاؤس (متصل پاکستان منٹ۔ نزد شالامار باغ) میں منعقد ہوگی۔

(۲) رہائش اور خوراک کا انتظام صرف نمائندگان کے لئے ہوگا۔ بصرین کے لئے نہیں ہوگا۔ خصوصی مہمان ادارہ کی طرف سے مدعو ہوں گے۔ یہ مہمان کنونشن کے کھلے اجلاس میں شرکت کر سکیں گے۔ اس اجلاس میں شرکت نہیں کر سکیں گے جو صرف نمائندگان تک محدود ہوگا۔ بجز ان کے جنھیں کسی خاص مشورہ کے لئے مدعو کیا جائے۔

(۳) ہر بزم کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نمائندگان کنونشن میں شرکت کے لئے بھیجے۔

(۴) ہر نمائندہ سے جو شریک کنونشن ہوگا، مبلغ دس روپے (رہائش اور خوراک کے اخراجات کے لئے) لئے جائیں گے۔ (اس میں چائے یا دیگر مشروبات شامل نہیں) یہ رقم ۵ مارچ تک ناظم ادارہ طلوع اسلام کے نام بھیجدی جائے۔

(۵) ہر بزم کم از کم ایک نمائندہ بطور رضا کار بھیجے۔ ان رضا کاروں کے نام صدر کنونشن کمیٹی کے پاس ۲۰ مارچ تک پہنچ جانے چاہئیں۔ منتخب رضا کاروں کو کنونشن کمیٹی کی طرف سے چٹھیاں بھیجی جائیں گی۔ انھیں ۶ اپریل (۱۹۶۰ء) کی شام تک یا ۷ اپریل (جمعرات) کی صبح تک لاہور پہونچ جانا ہوگا۔

(۶) فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس دفعہ مختلف بزموں کے نمائندوں کو اظہار خیالات کا موقع دیا جائے گا۔ وہ متعین وقت کے اندر (جو دس منٹ سے زیادہ نہیں ہو سکیگا) قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اپنے خیالات اور عملی تجاویز کا اظہار فرما سکینگے جو نمائندگان اس میں حصہ لینا چاہیں وہ اس کے لئے تیار ہو کر آئیں۔

(۷) نمائندگان کو جمعرات کی شام تک لاہور پہونچ جانا چاہیئے۔ تعارفی اجلاس اسی شب کو منعقد ہوگا۔

(۸) تفصیلی پروگرام اپریل کے طلوع اسلام میں شائع ہوگا۔

(۹) چونکہ کنونشن میں آئینِ نو کے سلسلہ میں اہم امور سامنے آئیں گے۔ اس لئے ہر بزم کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نمائندگان

شرکت کے لئے بھیجے۔ محترم پرویز صاحب کے خطاب کا خصوصی موضوع بھی اسلامی آئین سے متعلق ہوگا۔

(۱۰) سابقہ کنونشن میں اپیل کی گئی تھی کہ کرسیاں وغیرہ خریدنے کے لئے فنڈ جمع کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل وعدے ہوئے تھے۔ ان میں جو رقوم وصول ہو چکی ہیں ان کے سامنے "وصول" لکھدیا گیا ہے۔ باقی وعدے ابھی تک ایفا نہیں ہوئے۔ ان بزموں سے اور انفرادی احباب سے جنھوں نے اپنے وعدے ابھی تک پورے نہیں کئے، استدعا ہے کہ وہ موعودہ رقوم پندرہ مارچ تک ضرور ارسال فرمادیں۔

بزمیں

۱۔ ہنگو	۱۰	وصول
۲۔ لاہور	۵۰۰	"
۳۔ سیالکوٹ	۵۰	
۴۔ چنیوٹ	۵۰	
۵۔ ضلع جہلم	۱۰	
۶۔ سید حسین ضلع جہلم	۱۰	وصول
۷۔ پنڈ دادنخان	۱۰	"
۸۔ کراچی	۱۰۰۰	
۹۔ چونڈہ	۱۰	
۱۰۔ سیالکوٹ چھاؤنی	۱۰	
۱۱۔ مردان	۲۰۰	
۱۲۔ سمندری	۱۰	وصول
۱۳۔ چک شمالی	۱۰	
۱۴۔ پنڈی	۱۰۰	
۱۵۔ گوجرہ	۱۰	وصول
۱۶۔ شیخوپورہ	۲۵	"
۱۷۔ ٹنڈو محمد خاں	۲۵	

انفرادی

۱۔ حاجی فقیر محمد صاحب	مردان	۲۰۰	وصول
۲۔ تجمل حسین صاحب	جھنگ	۵	"
۳۔ چوہدری افتخار احمد صاحب	لاہور	۲۵	
۴۔ محمد یامین صاحب	ملتان	۱۰	
۵۔ میسر فیروز دین صاحب سکھو چک سیالکوٹ		۱۰	وصول
۶۔ عبدالکریم صاحب	ننکانہ	۵	"
۷۔ بہزاد خاں صاحب	ٹیکسلا	۵	"
۸۔ غلام ربانی صاحب	ٹیکسلا	۵	"
۹۔ محمد شفیع صاحب	واہ	۱۰	"
۱۰۔ نجابت خاں صاحب	واہ	۲۰	"
۱۱۔ چوہدری عمر حیات صاحب ٹھیکیدار گوجرانوالہ		۲۰	"

میزان	۲۳۵۵
وصول شدہ	۸۵۵
واجب الوصول	۱۵۰۰

(چوہدری) عبدالرحمٰن

(صدر کنونشن کمیٹی)

بزموں کی رپورٹیں

مری۔ برف و باراں کے طوفانی مظاہروں کے بعد یہاں کا موسم خوشگوار رنگ اختیار کر رہا ہے۔ اس موسمی انقلاب

کے ساتھ ساتھ بزم کے احباب پھر سمٹ سمٹا کر ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے ہیں. چنانچہ ابھی ابھی سالِ رواں کا پہلا اجتماع مری میں ہوا اور احباب نے اس میں خاص طور پر شرکت کی. بزم کراچی کی طرف سے موسوم پمفلٹ "ہماری مسجدیں" تقسیم کیا گیا۔ "اسلام آگے کیوں نہ چلا؟" کی ایک صد مزید کاپیاں منگوا کر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا. طلوع اسلام کونشن کے سلسلے میں فیصلہ کیا گیا کہ زیادہ سے زیادہ احباب اس میں شرکت کریں۔

لاہور

۱۱ر فروری کو بزم کا پندرہ روزہ اجلاس دفتر بزم میں ہوا. طلوع اسلام کونشن کے انتظامات کے لئے احباب نے اپنی خدمات پیش کیں. بعض احباب نے طلوع اسلام کے نئے خریدار پیدا کرنے کی ذمہ داری لی. دفتر بزم طلوع اسلام میں دارالمطالعہ کے قیام کا ضابطہ طے کیا گیا. ہر شخص پانچ روپے بطور زر ضمانت درچار آنے ماہوار چندہ رکنیت کی ادائیگی سے رکن بن سکتا ہے۔

دیونہ منڈی

بزم کے حالیہ اجلاس میں چھ نئے احباب نے رکنیت قبول کی. پمفلٹوں کی تقسیم باقاعدگی سے جاری ہے اور ادارہ کی مطبوعات بھی برائے مطالعہ صاحب ذوق طبقہ کو مہیا کی جاتی ہیں۔

ڈیرہ غازیخاں

بزم کے احباب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے. میلہ اسپاں پر پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔

گوجرانوالہ

حالیہ اجلاس میں نمائندہ بزم شیخ محمد اقبال صاحب نے اپنی تقریر میں اس نکتہ کو وضاحت سے پیش کیا کہ ہماری تاریخ میں دینی لحاظ سے وہی کچھ سند قرار پا سکتا ہے جو قرآن کریم کے مطابق ہے. انھوں نے اپنے خطاب میں طلاق، ظہار اور نکاح کا قرآنی مفہوم بھی واضح کیا. پروفیسر انورسگ صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب "اسوۂ رسولؐ" سے متعلق تیسرا باب پڑھ کر سنایا. اور بتایا کہ اس سے امت کی ربوبیت کیونکر ہوتی. طلوع اسلام کونشن میں شرکت کے لئے ضلع کی مختلف بزموں سے نو احباب نے بحیثیت مندوب اور دو نے بطور مبصر اپنے نام پیش کئے۔

رسول نگر
(ضلع گوجرانوالہ)

بزم کے اجلاس میں مہر غلام حسین صاحب نے "اسلام آگے کیوں نہ چلا؟" کا مقالہ پڑھ کر سنایا اور پنجابی زبان میں ساتھ ہی ساتھ اس کی وضاحت کی. طلوع اسلام کے مسلک و مقصد پر بھی تبادلہ خیالات ہوا. اس اجلاس میں دو نئے احباب شریک بزم ہوئے۔

سید حسین
(ضلع جہلم)

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں اور پمفلٹوں کی تقسیم بھی. دو نئے احباب نے بزم کی رکنیت قبول کی۔

پشاور

پشاور سے بزم کے سرگرم رکن میاں محمد نذیر ساول اور نوشہرہ سے محترم شیر بہادر خاں صاحب ایڈووکیٹ بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب میں کامیاب ہوئے ہیں. منتخبین میں سے ایک صاحب استطاعت نے (جو اپنے نام کی شہرت نہیں چاہتے) بزم کو ایک عمدہ ٹیپ ریکارڈر خرید کر دیا ہے اور اس کی بدولت اب پرویز صاحب کے تازہ بتازہ خطاب پشاور کی فضا میں فردوس بہ گوش بن سکیں گے۔

پیر بخ کسی (ضلع ملتان)
اجلاس ہائے بزم میں احباب باقاعدگی سے شریک ہو رہے ہیں۔ آئندہ ہر ماہ دو اجلاس ہوا کریں گے۔

چک ۳۵ شمالی (ضلع سرگودھا)
چند ماہ کے سکوت کے بعد احباب بزم اب نئے ولولوں سے سرگرم کار ہوئے ہیں۔ اراکین بزم میں چار نئے احباب کا اضافہ ہوا ہے۔ دو خریدار طلوع اسلام کے بنے۔ سرگودھا شہر میں مولوی محمد جمیل صاحب اور فیض علی صاحب کی کوششوں سے فضا دن بدن سازگار ہو رہی ہے۔

پنڈ دادنخاں (ضلع جہلم)
ادارہ کے مسلک و مقصد کا تسلیم قلبی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہاں کے ممتاز بزرگ راجہ سکندر خاں صاحب نے بزم کی رکنیت قبول کر لی ہے۔ بزم کے ایک رکن حافظ عبدالمجید صاحب جو یہاں خطیب بھی ہیں اپنے خطبات میں سلسلہ معارف القرآن کی اہم کڑیاں پیش کر رہے ہیں۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ)
بزم کی سرگرمیاں وسعت پذیر ہیں جس کے باعث طلوع اسلام کے پرچوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ دو مستقل خریدار بنے ہیں۔ ادارہ کی مطبوعات کے مطالعہ کا شوق روز افزوں ہے۔ محترم صدیق صاحب نے سرگودھا میں بزم کے قیام کی کوشش کی ہے جو کامیاب ہو رہی ہے۔

شیخوپورہ
ادارہ کے تازہ پمفلٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ نئے دفتر کی مرمت مکمل ہونے پر وہاں دار المطالعہ بھی قائم کر دیا جائے گا۔

بزم طلوع اسلام لاہور کے آئندہ اجلاس:- مارچ ۱۹۶۰ء میں۔ بزم طلوع اسلام لاہور کے پندرہ روزہ اجلاس دس اور چوبیس تاریخ کو بوقت چھ بجے شام، بزم کے دفتر میں ہوں گے۔ افطاری کا انتظام کر دیا جائے گا۔ بزم کے اراکین نوٹ فرمالیں۔

(نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور)

لغات القرآن:- آپ احباب کو یہ معلوم کر کے انتہائی خوشی ہوگی کہ سال بھر کی جد و جہد کے بعد لغات القرآن اپنے زیر اہتمام چھپنی شروع ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں دن رات کام کیا جا رہا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آئندہ کنونشن میں اس کی پہلی جلد احباب کی خدمت میں پیش کر دیں۔ خدا کرے کہ اس میں کوئی ایسا امر مانع نہ ہو جائے جس پر ہمیں اختیار نہ ہو۔ کتاب کس حسن کارانہ انداز سے چھپی ہے اس کا اندازہ آپ کتاب دیکھ کر لگا سکیں گے۔ پہلی جلد پانصد سے زائد صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اور قیمت پندرہ روپے۔ احباب اپنی فرمائشیں پہلے بھیج دیں تاکہ کوشش کی جائے کہ کم از کم اتنی کتابیں کنونشن تک تیار ہو جائیں۔ چونکہ لغات کا فنڈ بالکل الگ رکھا گیا ہے اس لئے پیشگی خریداران کو یہ کتاب ان کے کھاتے کے حساب سے نہیں مل سکے گی۔ لہٰذا وہ بھی اپنی فرمائشیں بھیج دیں۔

نہایت ضروری خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(ناظم ادارہ)